Urdu Final Reader

(Prescribed as text-book for Class VII of Vernacular Schools for Boys by the Educational Department, United Provinces)

اُردو فائینل ریڈر

لڑکوں کے ورنا کیولر مدارس کی ساتویں جماعت کے واسطے

FIRST EDITION

ALLAHABAD
PRINTED AND PUBLISHED BY THE INDIAN PRESS
1917

فہرست مضامین

حصۂ اوّل نثر

حصّۂ دوم نظم

حصّۂ اوّل ۔ نثر

میر امّن دہلوی

آپ کے آبا و اجداد ہمایوں بادشاہ کے زمانہ سے شاہانِ دہلی کے جاں نثار اور معزز منصب دار تھے۔ خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی کے لقب سے سرفراز تھے۔ سلطنت مغلیہ کے ضعف اور انحطاط کے زمانہ میں سورج مل جاٹ نے اِن کی جاگیر ضبط کر لی اور احمد شاہ درّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ اُس وقت اُن کو اپنا وطنِ آبائی چھوڑنا پڑا۔ کئی برس عظیم آباد میں قیام کیا۔ کوئی صورت روزگار کی نہ نکلی ناچار بہ تلاشِ معاش کلکتہ پہونچے۔ وہاں دو سال تک نواب دلاور جنگ کے بھائی میر محمد کاظم خان کے اتالیق رہے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف ایک کالج اُن انگریزوں کی تعلیم کے واسطے قایم ہوا تھا۔ جو ولایت سے کمپنی کے ملازم ہو کر نئے نئے ہندوستان میں وارد ہوتے تھے۔ اُس زمانہ میں لارڈ ولزلی صاحب مقبوضاتِ کمپنی

کے گورنر جنرل تھے۔ اور جان گلکرسٹ صاحب اِس کالج کے پرنسپل تھے۔ صاحب موصوف کو ہندوستانی زبان کی تدوین کا خاص شوق تھا۔ اُردو زبان کی گرامر اور ڈکشنری خود لکھی تھی۔ اور ذی استعداد لوگوں سے اُردو نثر میں اکثر کتابیں لکھوائیں تھیں۔ منشی میر بہادر علی نے میر صاحب کو پرنسپل صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ اور ۱۸۰۱ء میں قصۂ چہار درویش مصنفۂ امیر خسرو دہلوی کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کے لئے مامور ہوئے۔ یہی کتاب آجکل باغ و بہار کے نام سے مشہور ہے۔ اِس کتاب کی زبان اگرچہ سو برس سے زیادہ پہلے کی ہے۔ مگر سلیس اور بامحاورہ ہے۔ میر صاحب خود فرماتے ہیں کہ میری اُردو ٹکسالی ہے۔ کیونکہ میں دلّی کا روڑا اور یہیں کا پروردہ ہوں۔ باغ و بہار اُس زمانہ کے روزمرّہ کے محاوراتِ دہلی کا نہایت صحیح نمونہ ہے ۔
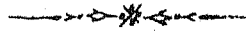
سیر پہلے درویش کی

(ماخوذ از باغ و بہار)

پہلا درویش دو زانو ہو بیٹھا اور اپنی سیر کا قصہ اس طرح سے کہنے لگا۔ یا معبود اللہ ذرا ادھر متوجہ ہو اور ماجرا مجھ بے سر و پا کا سنو۔ رباعی

یہ سرگذشت میری ذرا کان دھر سنو مجھ کو فلک نے کر دیا زیر و زبر سنو
جو کچھ کہ پیش آئی ہے شدت مرے تئیں اُس کا بیان کرتا ہوں تم سر بسر سنو

اے یاران میری پیدایش اور وطن (بزرگوں کا ملک) یمن ہے۔ والد اس عاجز کا ملک التجار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا۔ اُس وقت میں کوئی مہاجن یا بیوپاری اُن کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے خرید فروخت کے واسطے مقرر تھے اور لاکھوں روپیہ نقد اور جنس مُلک مُلک کے گھر میں موجود تھے۔ اُن کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے ایک تو یہی فقیر جو کفنی سیلی پہنے ہوئے مُرشدوں کے حضور میں حاضر اور بولتا ہے۔ دوسری ایک بہن جس کی قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی اور شہر کے سوداگر بچے سے شادی کر دی تھی وہ اپنی سُسرال

میں رہتی تھی غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو اُس کے
لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے۔ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوچلوں سے ماں
باپ کے سائے میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا سپاہ گری کا
کسب و فن سوداگری کا بہی کھاتا روزنامہ سیکھنے لگا چودہ برس تک
نہایت خوشی اور بے فکری میں گذری کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں
نہ آیا یک بیک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مر گئے
عجب طرح کا غم ہوا کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا ایکبارگی یتیم ہو گیا
کوئی سر پہ بڑا بوڑھا نہیں رہا اس مصیبتِ ناگہانی سے رات دن رویا
کرتا کھانا پانی سب چھوٹ گیا چالیس دن جیوں تیوں کر کٹے۔
چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے
فراغت ہوئی سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا دنیا
میں سب کے ماں باپ مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز
مرنا ہے پس صبر کرو اپنے گھر کو دیکھو اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے
اپنے کاروبار لین دین سے ہوشیار رہو تسلی دیکر وہ رخصت ہو گئے۔
گماشتے کاروباری نوکر چاکر جتنے تھے آن کر حاضر ہوئے نذریں دیں
اور بولے کوٹھی نقد و جنس کی اپنی نظر مبارک سے دیکھ لیجئے یکبارگی
جو اس دولت بے انتہا پر نگاہ پڑی آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی

تیاری کو حکم کیا فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت پردے چلمنیں تکلّف کی لگا دیں اور اچھے اچھے خدمتگار و بیدار و نوکر رکھے سرکار سے زرق برق پوشاکیں بنوائیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا کے بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غنڈے پھانکڑے مفت پر کھانے پینے والے جھوٹے خوشامدی آکر آشنا ہوئے۔ اور مصاحب بنے۔ ان سے آٹھ پہر صحبت ہونے لگی۔ ہر کہیں کی باتیں اور زٹلیں واہی تباہی اِدھر اُدھر کی کرتے اور کہتے۔ اِس جوانی کے عالم میں کیتکی کی شراب یا گلِ گلاب کھنچوائیے نازنین معشوقوں کو بلوا کر اُن کے ساتھ پیجیئے اور عیش کیجئے۔ غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے ہر دم کے کہنے سُننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب۔ ناچ اور جوئے کا چرچہ شروع ہوا پھر تو یہ نوبت پہونچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور لینے دینے کا سودا ہوا اپنے نوکروں اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی جو جس کے ہاتھ پڑا الگ کیا گویا لوٹ مچادی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ کہاں سے آتا ہے اور کدھر جاتا ہے۔ مالِ مُفت دلِ بیرحم۔ اِس فضول خرچی کے آگے اگر گنجِ قارون بھی ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصہ میں یکبارگی یہ حالت ہوگئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ وہ آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچا بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نثار

کرتے تھے کافور ہو گئے بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات
ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر مُنہ پھیر لیتے اور نوکر چاکر خدمت گار سب حیلے
ڈھلیت خاص پر دار ثابت خانی سب چھوڑ کر کنارے لگے کوئی
بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے یہ کیا تمھارا حال ہوا سوائے غم اور
افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھیرا۔ اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں
جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑاکے کے کھینچے تاب بھوک
کی نہ لا سکا ناچار بیحیائی کا بُرقع مُنھ پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے
پاس چلیے لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد
نہ بہن سے کچھ سلوک کیا نہ خالی خط لکھا بلکہ اُس نے دو ایک خط
خطوط ماتم پُرسی اور اشتیاق کے جو لکھے ان کا بھی جواب اِس
خواب خرگوش میں نہ بھیجا اِس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا پر
سوائے اُس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھیرا جیوں تیوں پاپیادہ
خالی ہاتھ گرتا پڑتا ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر ہمشیر کے
شہر میں جا کر اُس کے مکان پر پہونچا وہ ماں جائی میرا حال دیکھ کر
بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی تیل کالے ماش اور ٹکے مجھ پر سے
صدقے کیے۔ کہنے لگی اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا لیکن
بھیا تیری یہ کیا صورت بنی اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا آنکھوں میں

آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی سے خاصی پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا نہا دھو کر کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس بہت اچھا تکلف کا میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات حلوا سوہن پستہ مغزی ناشتے کو اور تیسرے پہر میوے خشک و تر پھل پھلاری اور رات دن دونوں وقت پلاؤ و نان قلیہ کباب تحفہ تحفہ مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی سب طرح خاطر داری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا خدا کی درگاہ میں ہزار ہزار شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گذرے کہ پاؤں اُس خلوت سے باہر نہیں رکھا ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی کہنے لگی اے بھائی تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے گھر میں بیٹھے رہنا ان کو لازم نہیں جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اُس کو دنیا کے لوگ طعنا مہنا دیتے ہیں خصوص اس شہر کے لوگ چھوٹے بڑے سب تمھارے رہنے پر کہیں گے کہ اپنے باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آپڑا یہ نہایت بے عزتی ہے اور میری تمھاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے

تہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور تجھے کلیجے میں
ڈال رکھوں اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں
اور اس حیرانی او مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔ یہ بات
سُن کر مجھے بھی غیرت آئی اُس کی نصیحت پسند کی جواب دیا اچھا اب تم
ماں کی جگہ ہو جو کہو سو کروں۔ یہ میری مرضی پا کر گھر میں جا کے پچاس
توڑے اشرفی کے اصیل اور لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے
آگے لا رکھے اور بولی کہ ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے۔
تم ان روپیوں سے جنس تجارت خرید کرو ایک تاجر ایماندار کے
حوالے کر کے دستاویز پکی لکھوالو اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔
جب خیریت سے جا پہونچو اپنا مال معہ منافع سمجھ بوجھ لیجیو یا آپ بیچیو
میں وہ نقد لیکر بازار میں گیا اسباب سوداگری کا خرید کر کے ایک بڑے
سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت خواند سے خاطر جمع کر لی وہ تاجر دریا کی
راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی
تیاری کی جب رخصت ہونے لگا بہن نے ایک سراپا بھاری
خلعت اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان
ایک خاصدان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شکاربند
میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا دہی کا

ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی سدھارو تمہیں خدا کو سونپا پیٹھ دکھائے جاتے ہو اسی طرح جلد اپنا مُنہ دکھائیو میں نے فاتحہ خیر پڑھ کر کہا تمہارا بھی خدا حافظ ہے میں نے قبول کیا۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خدا کے توکّل پر بھروسا کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہونچا غرض جب شہر کے دروازے پر گیا بہت رات جا چکی تھی دربان اور نگہبانوں نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے بہت منّت کی مسافر ہوں۔ دُور سے دھاوا مارے آتا ہوں اگر کواڑہ کھول دو شہر میں جا کر کے دانہ گھاس کا آرام پاؤں۔ اندر سے گھُرک کر بولے اِس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں ہے کیوں اتنی رات گئے تم آئے جب میں نے جواب صاف اُن سے سُنا شہر پناہ کی دیوار کے نیچے گھوڑے پر سے اُتر زین پوش بچھا کر جاگنے کی خاطر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا ؎
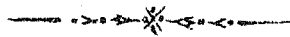
سیر تیسرے درویش کی

(ماخوذ از باغ و بہار)

تیسرا درویش لنگوٹا باندھ بیٹھا۔ اور اپنی سیر کا ماجرا اس طرح سے بیان کرنے لگا۔ رُباعی

احوال اِس فقیر کا اے دوستاں سُنو ۔ یعنی جو مجھ پہ بیتی ہے وہ داستاں سُنو
جو کچھ کہ شاہِ عشق نے مجھ سے کیا سلوک ۔ تفصیل وار کہتا ہوں اُس کا بیاں سُنو

کہ یہ کمترین بادشاہ زادہ عجم کا ہے میرے ولی نعمت وہاں کے بادشاہ تھے اور سوائے میرے کوئی فرزند نہ رکھتے تھے۔ میں جوانی کے عالم میں مصاحبوں کے ساتھ چوسر گنجیفہ شطرنج تختہ نرد کھیلا کرتا تھا سوار ہو کر سیر و شکار میں مشغول رہتا۔ ایک دن کا یہ ماجرا ہے کہ سواری تیار کروا کر اور سب یار آشناؤں کو لیکر میدان کی طرف نکلا باز بہری جرّہ باشا سُرخاب اور تیتروں پر تیر اُڑاتا ہوا دُور نکل گیا۔ عجب طرح کا ایک بہار کا قطعہ دیکھا کہ جدھر نگاہ جاتی تھی کوسوں تلک سبزہ اور پھولوں سے لال زمین نظر آتی تھی۔ یہ سماں دیکھ کر گھوڑوں کی باگیں ڈال دیں اور قدم قدم سیر کرتے ہوئے چلے جاتے

تھے ناگاہ اُس صحرا میں دیکھا کہ ایک کالا ہرن اُس پر زربفت کی جھول
اور بھنور کلی مُرصّع کی اور گھونگرو سونے کے زردوزی پٹے میں ٹکے
ہوئے گلے میں پڑے خاطر جمع سے اُس میدان میں کہ جہاں انسان کا
دخل نہیں اور پرندہ پر نہیں مارتا چرتا پھرتا ہے ہمارے گھوڑوں کے
سُم کی آہٹ پا کر چونکتا ہوا اور سر اُٹھا کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلا۔
مجھے اُس کے دیکھنے سے یہ شوق ہوا۔ رفیقوں سے کہا کہ تم یہیں کھڑے
رہو میں اُسے جیتا پکڑوں گا۔ خبردار تم آگے قدم نہ بڑھانا اور میرے
پیچھے نہ آنا۔ اور گھوڑا میرے زانو تلے ایسا پرند تھا کہ بارہا ہرنوں کے
اوپر دوڑا کر اُن کی کرچھالوں کو بھلا کر ہاتھوں سے پکڑ پکڑ لئے تھے
اُس کے پیچھے دوڑایا۔ وہ دیکھ کر چھلانگیں بھرنے لگا۔ اور ہوا ہوا
گھوڑا بھی باد سے باتیں کرتا تھا۔ لیکن اُس کی گرد کو نہ پہونچا۔ وہ
رہوار بھی پسینے پسینے ہوگیا اور میری زبان مارے پیاس کے چٹکنے
لگی پہ کچھ بس نہ چلا شام ہونے لگی اُس وقت میں کیا جانوں کہاں سے
کہاں نکل آیا۔ ناچار ہو کر اُسے بھلاوا دیا اور ترکش میں سے تیر نکال کر
اور قربان سے کمان سنبھال کر چلّے میں جوڑ کر کشش کان تلک لاکر
ران کو اُس کی تاک کر اللہ اکبر کہکر مارا بارے پہلا ہی تیر اُس کے
پاؤں میں ترازو ہوا تب لنگڑاتا ہوا پہاڑ کے دامن کے سمت چلا فقیر بھی

گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور پاپیادہ اُس کے پیچھے لگا اُس نے پہاڑ کا ارادہ کیا اور میں نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ کئی اُتار چڑھاؤ کے بعد ایک گنبد نظر آیا جب پاس پہونچا ایک باغیچہ اور ایک چشمہ دیکھا۔ وہ ہرن تو نظر سے چھلاوہ ہوگیا۔ میں نہایت تھکا تھا ہاتھ پاؤں دھونے لگا۔ ایکبارگی آواز رونے کی اُس برج کے اندر سے میرے کان میں آئی جیسے کوئی کہتا ہے کہ اے بچے جس نے تجھے تیر مارا میری آہ کا تیر اُس کے کلیجے میں لگیو۔ وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے۔ اور خدا اُس کو میرا سا دُکھیا بناوے۔ میں یہ سُن کر وہاں گیا۔ دیکھا تو ایک بزرگ ریش سفید اچھی پوشاک پہنے ایک مسند پر بیٹھا ہے اور ہرن آگے لیٹا ہے۔ اُس کی ران سے یہ تیر کھینچتا ہے اور بددعا دیتا ہے۔ میں نے سلام کیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضرت سلامت یہ تقصیر نادانستہ اس غلام سے ہوئی۔ میں یہ نہ جانتا تھا خدا کے واسطے معاف کرو۔ بولا کہ بے زبان کو تو نے ستایا ہے اگر انجان یہ حرکت تجھ سے ہوئی اللہ معاف کرے گا۔ میں پاس جا بیٹھا اور تیر نکالنے میں شریک ہوا۔ بڑی دقّت سے تیر کو نکالا اور زخم میں مرہم بھر کر چھوڑ دیا۔ پھر ہاتھ دھو دھا کر اُس پیر مرد نے کچھ حاضری جو اُس وقت موجود تھی مجھے کھائی۔ میں کھا کر سو رہا۔ ماندگی کے سبب خوب سویا۔ اُس نیند میں آواز نوحہ و زاری کی کان میں آئی آنکھیں مل کر جو دیکھا تو اُس مکان میں نہ وہ بوڑھا ہے نہ کوئی اور ہے۔ اکیلا میں ایک پلنگ پر لیٹا ہوں اور وہ دالان خالی پڑا ہے ❊

مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا اصغر علی لکھنوی کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ زبان ریختہ میں آغا نوازش حسین خاں نوازش کے شاگرد تھے۔ نظم میں کمتر اور نثر میں اکثر خامہ فرسائی کی ہے۔ نثر میں ان کی تمام تصانیف اس طرزِ تحریر کا نمونہ پیش کرتی ہیں جس کو نثر مرجز کہتے ہیں۔ اور جس میں تصنع اور بناوٹ کو زیادہ دخل ہے۔ آپ زیادہ تر لکھنؤ میں رہے۔ اور شاہان اودھ کے ثناگر اور مدح خواں تھے۔ غدر کے بعد مہاراجہ بنارس نے بہت قدر افزائی کی ان کی تالیفات میں فسانۂ عجائب زیادہ مشہور اور مطبوع ہے۔ جو بعہد نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ لکھی گئی۔ ایک اور کتاب سرور سلطانی شمشیر خانی کا ترجمہ اور شاہنامہ فردوسی کا خلاصہ ہے۔ ایک نثر اور ایک قصیدہ پرنس آف ویلز و بعہد ملکہ وکٹوریہ کے جشنِ شادی کی تہنیت میں لکھا ہے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

باپ میں شوکتِ شاہی تھی پسر زینتِ تخت
ماں کے پرتو سے پرستانہ ہے شہر لندن

ایک نثر مہاراجہ بنارس کی سواری کی تعریف میں لکھی ہے۔ رنگ جملہ تصانیف کا ایک ہی ہے۔ جو اب بالکل متروک ہے۔ اگر عہدِ شاہی کی نثر اُردو یا متوسطین کی نثر فارسی دیکھنا مقصود ہے تو تصانیف سُرور سے بہتر کتاب نہ ملے گی ؎
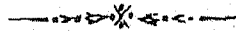
انتخاب از فسانۂ عجائب

آغازِ داستانِ نادر بیانِ صاحبِ سریرِ سلطانی مالکِ اورنگِ کامرانی زینتِ تاج و تختِ شاہنشاہِ گردوں بارگاہِ شاہ فیروز بخت

اور پیدا ہونا شہزادۂ جانعالم کا اور شادی ماہِ طلعت سے

مثل ہی سے نہ الفاظِ تلازم سے یہ خالی ہے　　ہر اک فقرہ کہانی کا گواہِ بے مثالی ہے
یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ　　سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

گرہ کشایانِ سلسلۂ سخن و تازہ کنندگانِ فسانۂ کہن یعنی محرّرانِ رنگیں
تحریر و مورّخانِ جادو تقریر نے اشہبِ جہندۂ قلم کو میدانِ وسیع بیان
میں باکرشمۂ سحر ساز و لطیفہ ہائے حیرت پرداز گرمِ عنان و جولان یوں
کیا ہے کہ سرزمینِ ختن میں ایک شہر تھا مینو سواد بہشت نژاد پسندِ
خاطرِ محبوبانِ جہاں قابلِ بود و باشِ خوبانِ زماں شمیمِ صفت اس کی
معطّر کنِ دماغِ جاں مسکنِ التہاب قلب دافعِ خفقان زمین اس کی
رشکِ چرخِ بریں رفعت و شان چشمک زن بلندیِ فلکِ ہفتمیں

گلی کوچہ خجالت دہ گلشن آبادی گلزار بساں تختۂ چمن بازار ہر ایک کے آزار مصفّا ہموار دوکانیں نفیس مکان پائدار خلقِ خدا با خاطرِ شاد اُسے فصحت آباد کہتے تھے سب طرح کی خلقت رغبت سے اُس میں رہتی تھی والیِ ملک وہاں کا شاہِ گردوں وقار پُر تمکین بافتخار سکندر سے ہزار خادم دارا سے لاکھ فرماں بردار قباد شوکت وکاؤس حشمت مالکِ تاج وتخت والا مرتبت عالی مقام شاہنشاہ فیروز بخت نام موجِ بخشش سے اُس بحرِ جود وعطا کی سائلاں لبِ تشنہ سیراب اور نائرہ غضب کے شعلہ سے دشمن وبد باطن جگر سوختہ بیتاب دبدبۂ داد دہی غلغلۂ عدالت سے دشمن دوستِ جانی چور مسافر کے مال کا نگہبان ڈکیتوں کو عہدۂ پاسبانیٔ ملک وافر سپاہ افزوں از قیاس خزانہ لا انتہا وزیر امیر جاں فشاں تاج بخش باج ستاں محتاج اور فقیر کا شہر میں نام نہیں داد وفریاد وآہ ونالے سے کسی کو کام نہیں رعیت راضی سپاہ جان نثار شاداں دشمن خایف شمع کا چور سرِ محفل لرزاں اس نام سے یہ ننگ تھا کہ امیروں کا چور محل نہ ہونے پاتا تھا دزدِ حنا کا رنگ نہ جمتا تھا سرِ دست ہاتھ باندھا جاتا تھا آنکھ چرانے سے ہم چشم چشمک کرتے تھے کار تیرے اگر کوئی جی چراتا تو نامردی کی تہمت اُس پہ دھرتے تھے لیکن بایں حکومت وثروت کا شانۂ امید کا چراغ گلِ اولاد

بالکل نہ تھی۔ خواہشِ فرزند در دل نہ ہونے کی کاہش منفصل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لڑکے کی تمنّا میں
بادشاہ مثلِ گدا دست دراز ایسا لاپروا بے نیاز کی قدرت سے بانیاز آخرش جنابِ باری میں تضرّع و زاری اُس کی منظور ہوئی لاولدی کی بدنامی دور ہوئی ساٹھ برس کے سن میں گوہرِ آبدار دُرِ شاہوار صدفِ بطنِ بانوی خجستہ اطوار سے پیدا ہوا چھوٹا بڑا اُس کی صورت کا شیدا ہوا۔ اُس روح افزا کا فیروز بخت نے جانعالم نام رکھا۔ شب و روز پرورش سے کام رکھا۔ حُسن اللہ نے یہ عطا کیا کہ نیّرِ اعظم چرخِ چہارم پر رشکِ جمال سے تھرّایا اور ماہ باوجود داغِ غلامی تابِ مشاہدہ نہ لایا اُس نقشِ قدرت پر مصوّرِ مانی و بہزاد حیران اور صنّاعی آذر کی ایسے لعبتِ حقیقت کے روبرو پشیمان۔ کاسۂ سر سراسر شورِ جوانی زورِ شباب سے معمور آنکھیں جھپکانے والی دیدۂ غزالانِ ختن کی شرابِ عشق کے نشہ سے چکنا چور۔ چہرے پر جلالِ شاہی شوکتِ جہاں پناہی نمایاں حُسنِ درخشندہ کی تڑپ سے انجم و اخترِ تاباں۔ مصحفی

اُسے دیکھ طفلی میں کہتی تھی دایہ یہ لڑکا طرحدار پیدا ہوا ہے

ع پارہ خواہد شد ازیں دستِ گریبانے چند

لکھا ہے کہ جب وہ مہر سپہر سلطنت برجِ حمل سے جلوہ افروز ہو
زینت بخش کنار مادر و زیب دہ آغوش دایہ ہوا درِ خزانہ و محبس
کھلا ہزارہا قیدی رہا ہو اپنے گھر آیا۔ اور سیکڑوں لونڈی غلام نے
فرمانِ آزادی پایا۔ شہر میں محتاج ناپید اتھا مگر اشرفی روپیہ حاجیوں
کے واسطے مکہ معظمہ اور زائروں کی خاطر کربلائے معلٰی میں بھیجا ایک
سال کا خراج رعیتِ محتاج کو معاف ہوا شہزادہ کے نام کے گنج آباد
ہوئے۔ مسجدیں مدرسے مہمان سرا مسافر خانے تعمیر ہوئے اہلِ شہر
دل شاد ہوئے ..... کوئی برسوں میں بڑھتا ہے وہ نہالِ نودمیدہ
بستانِ سلطنت گھڑیوں بلند بالا ہوتا تھا چند عرصہ میں بحول و قوتِ
الٰہی وہ ہاتھ پانوں نکالے دس برس کے سن میں اُس غزال چشم
نے ہرن کے سینگ چیر ڈالے۔ دست و بازو میں یہ طاقت ہوئی
کہ درندۂ فیلِ مست ہوا جوانِ رعنا چہرۂ زیبا رُستم شوکت اسفندیار
سے زبردست ہوا جو اُس کا رُوئے منوّر دیکھتا یہ کہتا۔

منھ دیکھو آئینہ کا تری تاب لا سکے — خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے
تصویر تیری کھینچے مصوّر تو کیا مجال — دستِ قضا تو پھر کوئی تجھسا بنا سکے

تحصیلِ علم و فضل میں شہرۂ آفاق ہوا۔ جتنے فنِ سپہگری ہیں اُن کا
مشّاق کامل جمیع علوم ہر فن میں طاق ہوا۔ جل جلالہٗ باپ ویسا

بیٹا ایسا محبوب محبت میں بسانِ یوسف و یعقوب علیہم السلام جب وہ ہلالِ سپہرِ شہریاری بدرِ کامل ہوا اور چودھواں برس بھر گیا۔ جوانوں میں شامل ہوا بہ صلاح و صواب دیدِ ارکانِ سلطنت و ترقّی خواہانِ دولت شادی کی تجویز ہوئی بہ تلاشِ بے شمار و تجسّسِ بسیار ایک شہزادی پری پیکر خوبصورت نیک سیرت حور نژاد گُل اندام سیمیں بر رشکِ شمشاد ماہِ طلعت نام دودمانِ والا سے مقرر ہوئی وہ جو آئینِ بادشاہی طریقِ فرمانروائی ہے اُسی طرح اُس کے ساتھ اِس اخترِ تابندہ کو ہمقران کیا۔

ترانہ سنجی عندلیبِ خامۂ گلشن بیان سواری شہزادۂ جانعالم میں اور خریدنا طوطے کا

بُلبلِ نواسنجِ ہزار داستان طوطیِ خامۂ زمزمہ ریز خوش بیان گلشنِ تقریر میں یوں چہکتا ہے کہ بعد رسمِ شادی سَیر و شکار کی اجازت سواری کا حکم شاہِ ذوالاقتدار سے حاصل ہوا۔ گاہ گاہ شام و پگاہ جانعالم سوار ہونے لگا ایک روز گذر اُس کا گُدڑی میں ہوا۔ انبوہِ کثیر جمِ غفیر نظر آیا اور غلغلۂ تحسین و آفرین از زمین تا چرخِ بریں بلند پایا۔ شہزادہ اُدھر متوجہ ہوا دیکھا ایک مردِ پیر نحیف ستّر اسّی برس کا سن

نہایت ضعیف پنجرا ہاتھ میں لئے کھڑا ہے اُس میں ایک جانور
مانند ساکنانِ جناں سبز پوش خانہ بدوش بامنقارِ گلنار
لطیفہ لطیف رنگین اور نکتے قابلِ تعریف تمکین مثالِ طوطیِ پسِ آئینہ
بیان کرتا ہے۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

شہزادہ کے دیکھتے ہی طوطا اپنے مالک سے بولا اے شخص کوکبِ بخت
تیرا افلاس کے برجِ تیرہ سے نکلا نصیب چمکا طالع بسر یاری و زمانہ
آمادۂ مددگاری ہوا۔ دیکھ ایسا شاہزادہ حاتم شعار ابرِ گہر بار منبع جود
اس مُشتِ پر ذرّۂ بے مقدار پر ہوا ہے وہ بیکار شئے کارگاہِ بے ثبات
میں ہوں جس کا طالب نہیں کہیں بجد یکہ جانور ہوں اور بلّی کا کھاجا
مگر جو یہ نظرِ عنایت کرے ابھی تیرا ہاتھ پُر زر ہو دامن گُہر سے بھر
جائے جانعالم نے اس سخنِ ہوش ربا کلمۂ حیرت افزا کو سُن طوطے عقل کے اُڑا
پنجرا اُس طائرِ ہمہ داں جانورِ سحر بیاں کا ہاتھ میں لیکے مالک سے
قیمت پوچھی طوطے نے کہا۔

کب لگاتا ہے کوئی اس دلِ بے حال کا مول
سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول

مگر جو حضور کی مرضی۔ جانعالم نے لاکھ روپیہ خلعت کے سوا عنایت کرکے

اور پنجرا ہاتھ میں لئے دولت سرا کو روانہ ہوا گھر میں جا ماہِ طلعت
کو طوطا دکھایا یہ مصرع انشا کا پڑھا۔

بازار ہم گئے تھے ایک چوٹ مول لائے

طوطے نے شہزادہ کو سخنانِ دلچسپ قصص عجیب حکایاتِ غریب شعرِ
خوب خمسہ ہائے مرغوب سنا اپنے دامِ محبت میں اسیر کیا یہ نوبت پہنچی
کہ سوتے جاگتے دربار کے سوا جُدا نہ ہوتا۔ جب دربار جاتا پنجرا
بتاکیدِ حفاظت ماہِ طلعت کو سونپ جاتا۔ اور دربار سے دیوانہ وار
بہ شوقِ گفتار بیقرار جلد پھر آتا۔
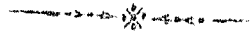
مرزا اسداللہ خاں۔ غالب

پہلے اسد تخلص کرتے تھے پھر اسد اللہ الغالب کی رعایت سے
غالب تخلص اختیار کیا۔ مگر ابتدائی غزلوں میں وہی پہلا تخلص قائم رہا۔
آبائی خاندان کا سلسلہ شاہانِ سلاجقہ بلکہ افراسیاب بادشاہ توران تک
پہونچتا ہے۔ مرزا صاحب کے جدِّ امجد وطن چھوڑ کر شاہ عالم بادشاہ
کے زمانہ میں دہلی تشریف لائے۔ اور شاہی دربار سے امیرانہ اعزاز
کے ساتھ منصب و جاگیر حاصل کی۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں پہلے
لکھنؤ اور حیدرآباد کی سرکاروں میں ملازم رہے پھر راجہ بختاور سنگھ والیِ
الور کی ملازمت اختیار کی یہاں کسی جنگ میں وہ مقتول ہوئے۔ مرزا
جن کی عمر اُس وقت ۵ سال سے متجاوز نہ تھی۔ اپنے چچا نصراللہ بیگ خاں
صوبہ دار اکبرآباد کے ظلِ عاطفت میں تربیت پاتے رہے۔ چچا کے
انتقال کے بعد جاگیر ضبط اور جائداد تباہ ہوگئی فقر و فاقہ تک نوبت پہونچی
کلکتہ میں استغاثہ پیش کیا وہاں بھی ناکامی کی صورت نظر آئی۔ شاہ اودھ
کی سرکار سے پانسو روپیہ سال بصلہ مدح گستری مقرر ہوئے تھے۔
دو برس بعد انقلابِ سلطنتِ اودھ واقع ہوا وہ وظیفہ بھی بند ہوگیا۔

اب صرف قلعہ کی تنخواہ اور پنشن پر گذارہ تھا وہ غدر میں موقوف ہوئی۔ نواب رام پور کو مرزا سے تلمذ تھا سو روپیہ مہینا مقرر کر دیا تاکید سے بلایا تعظیم سے ملے وظیفہ دو چند کر دیا۔ لیکن مرزا کو دلّی بغیر چین کہاں۔ چند روز کے بعد رخصت ہو کر پھر وہیں چلے آئے پنشن پھر جاری ہو گئی تھی اُسی پر قناعت کی اخیر عمر میں ضعف بڑھ گیا تھا خوراک کم ہو گئی تھی کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا آخر ۱۸۶۹ء میں جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ مرنے سے پہلے یہ شعر وردِ زبان تھا ؎

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے — عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

مولفِ آبحیات نے آہ غالب بمرد سے مادۂ تاریخ نکالا ہے۔ مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی نظم و نثر سے تھا اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ ہرمزد نام ایک پارسی ژند و پاژند کا عالم تھا مرزا نے قدیم پارسی اُس سے سیکھی تھی۔ اِس کے سوا اور کہیں سے تعلیم و تربیت کا پتہ نہیں چلتا اُنھوں نے فقط ذوقِ طبعی سے اپنے تئیں اس درجۂ کمال تک پہونچایا تھا۔ اِسی ذوقِ طبعی نے اُن کی فکر میں یہ بلند پروازی دماغ میں یہ معنی آفرینی۔ خیالات میں ایسا انداز۔ لفظوں میں نئی تراش اور ترکیب میں انوکھی روش پیدا کی۔ خود اُن کا قول ہے کہ زبانِ فارسی سے مجھے قدرتی لگاؤ اور اصلی مناسبت ہے۔

تصنیفات اُردو میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک دیوان انتخابی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اُس سے ہزاروں درجہ عالمِ معنی میں کلام بلند ہے۔ بلکہ اکثر شعر ایسے اعلےٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے ذہنِ نارسا وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ دو باتیں آپ کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اوّل یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی کا شیوہ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انھیں طبعی تعلق تھا اس لئے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح نہیں بولتے لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں۔ مرزا کے تالیفات نثر میں بھی لاجواب ہیں۔ اُردوئے معلیٰ اُردو کے خطوط کا مجموعہ ہے جن کی عبارت ایسی ہے کہ گویا آپ سامنے بیٹھے گل فشانی کر رہے ہیں۔ عودِ ہندی میں کچھ تقریظیں کچھ نثریں اور خطوط ہیں جس میں کہیں مشکل اشعار کے معنی حل کئے ہیں کہیں کسی امرِ تحقیق طلب کی توضیح کی ہے۔ لطائفِ غیبی۔ تیغِ تیز۔ ساطعِ برہان وغیرہ۔ فارسی کی تصنیفات میں کئی کتابیں ہیں ازانجملہ قصائد۔ غزلوں کا دیوان۔ پنج آہنگ۔ قاطع برہان۔ نامۂ غالب۔ مہرِ نیمروز۔ دستنبو زیادہ مشہور ہیں۔

رقعاتِ غالب

چودھری عبدالغفور کے نام

میرے مشفق چودھری عبدالغفور صاحب اپنے خط اور قصیدہ بھیجنے کا مجھکو شکر گذار اور قصیدۂ سابق کی اب تک اصلاح نہ پانے سے شرمسار تصور فرمائیں۔ اور ان دونوں قصیدوں کے باہم پہونچنے کا انتظار کریں۔

تحقیق کہ اب روئے سخن جناب فیض نصاب جامع مدارج جمیع الجمع۔ بزم وحدت کے فروزندۂ شمع۔ مستغرق مشاہدۂ شاہد ذات حضرت صاحب عالم صاحب قدسی صفات کی طرف ہے۔ پہلے کچھ باتیں کہ بادی النظر میں خارج از مبحث معلوم ہونگی لکھی جاتی ہیں :

میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔

اُنھوں نے نہ دئے مگر تین ہزار روپیہ سال اُس میں خاص میری ذات کا حصّہ ساڑھے سات سو روپیہ سال مَیں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کول برک صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرٹر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے۔ میرا حق دلانے پر رزیڈنٹ معزول ہو گئے سکرٹر گورنمنٹ بمرگِ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانہ کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ اُن کے ولیعہد نے چار سو روپیہ سال ولیعہد اِس تقرر کے دو برس کے بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانسو روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے یعنے اگرچہ اب تک جیتے ہیں۔ مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہیِ سلطنت دو ہی برس میں ہوئی دہلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی سات برس مجھکو روٹی دے کر بگڑی ایسے طالعِ مُربّی کُش اور مُحسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں اب مَیں جو والیِ دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جائیگا یا معزول ہو جائیگا۔ اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اُس کی ضایع جائیگی۔ اور والیِ شہر مجھکو کچھ نہ دیگا۔ اور احیاناً اگر اُس نے سلوک کیا۔ تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور مُلک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوندِ بندہ پرور یہ سب باتیں

وقوعی اور واقعی ہیں اگر ان سے قطع نظر کرکے قصیدہ کا قصد کروں قصد تو کر سکتا ہوں تمام کون کریگا سوائے ایک ملکہ کے وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق اپنے نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ میں نے یہ نثر کیونکر لکھی تھی اور کیونکر یہ شعر کہے تھے عبدالقادر بیدل کا یہ مصرعہ گویا میری زبان سے ہے +

مصرعہ - عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ +

پایانِ عمر ہے دل و دماغ جواب دے چکے ہیں سو روپیہ رامپور کے ساٹھ روپیہ پنشن کے روٹی کھانے کو بہت ہیں گرانی اور ارزانی امورِ عامّہ میں سے ہے دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلہ کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں۔ دیکھو منشی نبی بخش مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ ماہِ گذشتہ میں گذر گئے۔ مجھ میں قصیدہ کے لکھنے کی قدرت کہاں اگر ارادہ کروں تو فرصت کہاں۔ قصیدہ لکھوں آپ کے پاس بھیجوں آپ دکن کو بھیجیں متوسط کب پیش کرنے کا موقع پائے۔ پیش کئے پر کیا پیش آئے ان امُ اَمل کے ٹے ہوئے تک میں کیوں جیوں گا +

میر مہدی کے نام

برخوردار تمھارا خط آیا حال معلوم ہوا۔ میں اس خیال میں تھا کہ الور کا کچھ حال معلوم کرلوں اور کپتان الکزنڈر کا خط آئے اور میں اس کو میر سرفراز حسین کے مقدمہ میں لکھ لوں تو اُس وقت تمھارے خط کا جواب لکھوں۔ چونکہ آج تک اُن کا خط نہ آیا میں نے سوچا کہ اگر اسی انتظار میں رہوں گا اور خط کا جواب نہ بھیجوں گا تو میرا پیارا میر مہدی خفا ہوگا ناچار جو کچھ الور کا حال سُنا ہے وہ اور کچھ اپنا حال لکھتا ہوں۔ ہرچند میں نے دریافت کرنا چاہا حکیم محمود علی کا وہاں پہونچنا اور یہ کہ وہاں پہونچنے کے بعد کیا طور قرار پایا۔ کچھ معلوم نہیں ہوا صرف خبر واحد ہے کہ اُن کو راؤ راجہ نے صاحب اجنٹ سے اجازت لیکر بُلایا ہے۔ کہتے ہیں کہ صاحب اجنٹ الور نے راجہ کے بالغ اور عاقل ہونے کی رپورٹ صدر کو بھیجی ہے کیا عجب ہے کہ ان کا راج اِن کو مل جائے مولانا غالب علیہ الرحمۃ اِن دنوں میں بہت خوش ہیں پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستانِ خیال کی آگئی ہے سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب

پیار کرتے ہیں۔

میر سرفراز حسین کو اور میرن صاحب کو اور میر نصیر الدین صاحب کو
دعائیں اور دیدار کی آرزوئیں۔

رقعہ دیگر

اہاہا میرا پیارا میر مہدی آیا آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ
رام پور ہے دارالسرور ہے جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے پانی
سُبحان اللہ شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اُس کا
نام ہے بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اُس میں ملی ہے خیر
اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے۔ لیکن اتنا شیریں
کہاں ہوگا۔ تمھارا خط پہونچا۔ تردد عبث میرا مکان ڈاک گھر کے
قریب اور ڈاک منشی میرا دوست ہے نہ عُرف لکھنے کی حاجت نہ
محلہ کی حاجت بے وسواس خط بھیجدیا کیجئے اور جواب لیا کیجئے۔
یہاں کا حال سب طرح خوب ہے اور صحبت مرغوب ہے اِس وقت تک
مہمان ہوں دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ
فروگذاشت نہیں ہے لڑکے دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ اس وقت
اِس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

مولوی عبدالغفور خاں نسّاخ کے نام

جناب مولوی صاحب قبلہ۔ یہ درویش گوشہ نشین جو موسوم بہ اسد اللہ
اور متخلص بہ غالب ہے۔ مکرمت حال کا شاکر اور آیندہ افزایشِ عنایت کا
طالب ہے۔ دفترِ بے مثال کو عطیۂ کبریٰ موہبتِ عظمیٰ سمجھ کر یادآوری کا
احسان مانا۔ پہلے اِس قدر افزائی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ حضرت نے
اِس ہیچمرز ہیچمداں کو قابلِ خطاب و لائق عطائے کتاب جانا میں دروغ گو
نہیں خوشامد میری خو نہیں۔ دیوان فیض عنوان اسم بامسمیٰ ہے۔
دفترِ بے مثال اِس کا نام بجا ہے الفاظ متین معانی بلند مضمون عمدہ
بندش دل پسند ہم فقیر لوگ اعلانِ کلمۃ الحق میں بیباک و گستاخ ہیں
شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ
تھے آپ اُن سے بڑھ کر بہ صیغہ مبالغہ بے مبالغہ نسّاخ ہیں تم دانائے رموزِ
اُردو زبان ہو۔ سرمایۂ نازش قلمروِ ہندوستان ہو۔ خاکسار نے ابتدائے
سنِ تمیز میں اُردو زبان میں سخن سرائی کی ہے پھر اوسط عمر میں بادشاہِ
دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اُسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر
فارسی کا عاشق اور مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغِ اصفہانی
کا گھائل ہوں۔ جہانتک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت کچھ بکا۔

اب نہ فارسی کی فکر نہ اُردو کا ذکر۔ نہ دنیا میں توقع نہ عقبیٰ کی اُمید۔
مَیں ہوں اور اندوہِ ناکامیِ جاوید۔ جیسا کہ خود ایک قصیدہ نعت کی
تشبیب میں کہتا ہوں۔ شعر

چشم کشودہ اند بکردار ہاے من زآیندہ نا امیدم و از رفتہ شرمسار

ایک کم ستّر برس دنیا میں رہا۔ اب اور کہاں تک رہوں گا ایک اُردو
کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا ایک فارسی دیوان دس ہزار کئی سو
بیت کا تین رسالہ نثر کے یہ پانچ نسخے مُرتّب ہو گئے اب اور کیا کہوں گا
مدح کا صلہ نہ ملا غزل کی داد نہ پائی۔ ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی۔
بقول طالب آملی علیہ الرحمہ۔

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد

سچ تو یوں ہے کہ قوتِ ناطقہ پر وہ تصرّف اور قلم میں وہ زور نہ رہا۔
طبیعت میں وہ مزا سر میں وہ شور نہ رہا۔ پچاس پچپن برس کی مشق
کا ملکہ کچھ باقی رہ گیا ہے اِس سبب سے فنِ کلام میں گفتگو کر لیتا
ہوں۔ حواس کا بھی بقیہ اسی قدر ہے کہ معرضِ گفتار میں موافقِ
سوال جواب دیتا ہوں روز و شب یہ فکر رہتی ہے کہ دیکھئے وہاں
کیا پیش آتا ہے اور یہ بال بال گنہگار بندہ کیونکر بخشا جاتا ہے۔
حضرت سے یہ التماس ہے کہ آپ جواہد اکی بادی اور مجھکو ارسال نامہ

کی سبیل کے عادی ہوئے ہیں۔ جب تک میں جیتا رہوں۔ نامہ و پیام سے شاد اور بعد میرے مرنے کے دعائے مغفرت سے یاد فرماتے رہئے گا +

رقعہ بنام منشی ہرگوپال صاحب المتخلص بہ تفتہ

میاں مرزا تفتہ۔ ہزار آفرین۔ کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے۔ واہ واہ۔ چشم بد دور۔ تسلسل معنی۔ سلاستِ الفاظ۔ ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے توارد ہوا۔ یہ بھی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہونچا وہاں تم پہونچے۔ وہ مصرع یہ ہے

ع چاک گردیدم واز جیب بداماں رفتم

پہلا مصرع تمھارا اگر اُس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔ خدا تم کو اتنا جلائے کہ ایک دیوان بیس۲۰ جزو قصائد کا کہہ لو +

مگر خبردار قصاید بقیدِ حروفِ تہجی نہ جمع کرنا۔ صاحب مجھے اُس بزرگوار کا معاملہ اور یہ جو تم نے اُس کا وطن اور پیشہ اب لکھا ہے سابق کا تمھارا لکھا ہوا سب یاد ہے۔ میں نے اُس کو دوست بطریق طنز لکھا ہے۔ بہرحال وہ جو میں نے خاقانی کا شعر لکھ کر اُس کو بھیجا

اُس کی ماں مرے اگر میرے اُس خط کا جواب لکھا ہو۔ بڑا پرانا قصہ
تم نے یاد دلایا۔ داغِ کہنہ حسرت کو چمکایا۔ یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی
معرفت روشن الدولہ پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین
حیدر کے پاس گذرا۔ اور جس دن گذرا اُسی دن پانچ ہزار روپیہ
بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھکو اطلاع نہ دی۔
مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے اُنھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا۔
اور کہا کہ خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار میں نے
شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدہ پر
کیا گذری۔ اُنھوں نے جواب میں لکھا کہ پانچ ہزار ملے۔ تین ہزار
روشن الدولہ نے کھائے دو ہزار منشی محمد حسن کو دئے اور فرمایا کہ
اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیجدو۔ کیا اُس نے ہنوز تم کو
کچھ نہ بھیجا۔ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھکو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپیہ
بھی نہیں پہونچے۔ اس کے جواب میں اُنھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے
خط لکھو۔ اُس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ
بھیجا ہے اور یہ مجھکو معلوم ہوا کہ وہ قصیدہ حضور میں گذرا مگر میں نے
نہیں جانا کہ اُس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں اپنے نام
کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر اُن کا کھایا ہوا روپیہ اُن کے حلق سے

نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ
کیا آج خط روانہ ہوا تیسرے دن شہر میں خبر اُڑی کہ نصیر الدین حیدر
مر گیا۔ اب کہو میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے۔

غالب دوشنبہ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء

ایضاً

آؤ مرزا تفتہ۔ میرے گلے لگ جاؤ۔ بیٹھو اور میری حقیقت سنو
یکشنبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے۔ اُن سے سب حال معلوم ہوا۔
پہلا خط تم کو اُن کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم
رنگ ٹن صاحب کے لکھا تھا پھر ایک خط صاحب نے آپ مسودہ
کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا۔ دونوں دیوان تمھارے اور نشتر عشق
اور ایک تذکرہ یہ چار کتابیں تمھاری بھیجی ہوئی اُن کو پہونچیں صاحب
تم سے بہت خوش اور تمھارے بہت معتقد ہیں کہتے ہیں کہ ہم جانتے
ہیں کہ اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہوگا کہ جو پچاس ہزار
بیت کا مالک ہو۔ فائدہ اِس اِلتفات کا یہ کہ تمھارا ذکر بہت اچھی طرح
سے لکھیں گے باقی ما بخیر شما بہ سلامت۔ ہاں اُن کے تحت میں ۱۵ ضلعے
۲۰ عہدہ مشاہرہ کے علاقہ ہیں اگر تمھاری اجازت ہو تو اس امر میں
اُن سے کلام کروں۔ میرا عجب حال ہے۔ حیران ہوں کہ تمھیں

میرا کلام کیوں باور نہیں آتا۔

سامعہ مر گیا تھا۔ باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیس رام پور سو روپیہ مہینہ دیتے ہیں۔ سال گذشتہ اُن کو لکھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے۔ عوضِ خدماتِ سابقہ میں شمار کیجئے۔ اور اگر یہ عطیہ بشرطِ خدمت ہے۔ تو جو آپ کی مرضی ہے وہی میری قسمت ہے۔ بس دن سے اُن کا کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر تک آئی اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب از راہِ جواں مردی دئے جاتے ہیں۔ اور بھائی تمھاری مشق چشم بد دور صاف ہو گئی۔ رطب و یابس تمھارے کلام میں نہیں رہا۔ اور خواہی نخواہی تمھارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے تو میری جان میرے بعد کیا کروگے میں تو چراغِ دمِ صبح و آفتاب

سرگردہ ہوں۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

۱۴ رجب۔ نجات کا طالب غالب۔

ایضاً

ہاں صاحب تم کیا چاہتے ہو مجتہد العصر کے مسودہ کو اصلاح دیکر بھیجدیا۔ اب اور کیا لکھوں۔ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمھارا دماغ چل گیا ہے لفافہ کو کرید اکرو مسودہ کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤگے کیا یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں یہاں خیریت ہے وہاں کی خیر و عافیت مطلوب ہے خط تمھارا بہت دن کے بعد پہونچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا۔ اور دعا کہنا اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمہ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔ کیوں سچ کہیو اگلوں کے خطوط کی تحریر کے یہی طرز تھے۔ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے جب تک یوں نہ لکھو وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہِ بے آب ہے۔ ابرِ بے باراں ہے۔ نخلِ بے ثمر ہے۔ خانۂ بے چراغ ہے۔ چراغِ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امرِ ضروری کو لکھ لیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔ اور اگر تمھاری خوشنودی

اُسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نمازِ قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی۔ خیر ہم نے بھی وہ عبارت جو مسودہ کے ساتھ لکھی تھی اب لکھ بھیجی۔ قصور معاف کرو۔ خفا نہ ہو۔ میر نصیر الدین ایک بار آئے تھے پھر نہ آئے۔ فارسی نثر میں نے کہاں لکھی کہ تمھارے چچا کو یا تم کو بھیجوں۔ نواب فیض محمد خاں کے بھائی حسن علی خاں مر گئے۔ حامد علی خاں کی ایک لاکھ تیس ہزار کئی سو روپیہ کی ڈگری بادشاہ پر ہو گئی۔ کلّو داروغہ بیمار ہو گیا تھا آج اُس نے غسلِ صحت کیا۔ باقر علی خاں کو مہینے بھر سے تپ آتی ہے۔ حسین علی خاں کے گلے میں دو غدود ہو گئی ہیں۔ شہر چُپ چاپ نہ کہیں پھاوڑا چلتا ہے۔ نہ سُرنگ لگا کر کوئی مکان اُڑایا جاتا ہے۔ نہ آہنی سڑک آتی ہے۔ نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دلّی شہرِ خموشاں ہے۔ کاغذ نبڑ گیا ورنہ تمھارے دل کی خوشی کے واسطے ابھی اور لکھتا۔

ایضاً

برخوردار سعادت و اقبال نشان حکیم غلام نجف خاں کو میری دُعا پہونچے۔ تمھاری تحریر پہونچی تم جُداگانہ خط کیوں نہ لکھا کرو۔ خط لکھا اور بیرنگ یا پوسٹ پیڈ جس طرح چاہا اپنے آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر

بھیجدیا۔ مکان کا پتہ ضرور نہیں۔ ڈاک گھر میرے گھر کے پاس۔
ڈاک منشی میرا آشنا۔ اب تم ایک کام کرو آج یا کل ڈیوڑھی پر جاؤ۔
اور جتنے خط جمع ہیں وہ لو اور ان سنگی مضبوط کاغذ کا لفافہ کرو۔ اور
بیرنگ لکھ کر کلیان کے ہاتھ ڈاک گھر میں بھیجوا دو۔ اور اپنے خط
میں جو حال شہر میں نیا ہو وہ مفصل لکھو۔ جناب حکیم صاحب کو سلام
نیاز۔ اور ظہیر الدین احمد خاں کو دعا کہنا۔ اب میرا حال سنو۔ تعظیم
و توقیر بہت۔ ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں
پر مشتمل ہے۔ رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو دوا کو بھی میسر نہیں خشتی
مکان گنتی کے ہیں۔ کچی دیواریں اور کھپریل۔ سارے شہر کی آبادی
اسی طرح پر ہے۔ مجھکو جو مکان ملے ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔ ہنوز
کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ میں خود اُن سے ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی
مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے۔ مگر بواسطہ کارپردازان سرکار دیکھو کیا
کہتے ہیں اور کیا مقرر کرتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے پہونچنے کے بعد
جلد کوئی صورت قرار پائے گی۔ لیکن آج تک کہ جمعہ آٹھواں دن
میرے پہونچنے کو ہے کچھ کلام نہیں ہوا۔ کھانا دونوں وقت سرکار سے
آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلاف طبع
نہیں۔ پانی کا شکر کس مُنہ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے کوسی

سبحان اللہ اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے
صاف۔ سبک۔ گوارا۔ ہاضم۔ سریع النفوذ۔ اِس آٹھ دن میں قبض
و انقباض کے صدمہ سے محفوظ ہوں۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے
لڑکے بھی تندرست۔ آدمی بھی توانا۔ مگر ہاں ایک عنایت اللہ
دو دن سے کچھ بیمار ہے خیر اچھا ہو جائے گا۔ والدعا۔

جمعہ ۳ر فروری ۱۸۶۰ء

ایضاً

میاں تم نے بُرا کیا کہ لفافہ کھول کر نہ پڑھ لیا۔ بارے آج شنبہ
۱۴ر فروری صبح کے وقت یہ لفافہ پہونچا۔ اور اُسی وقت پڑھوایا گیا۔
خط لفٹنٹ گورنر بہادر کا نہیں۔ یہ خط نواب گورنر جنرل بہادر کے
چیف سکرٹر کا ہے۔ ترجمہ اُس کا یہ ہے "از دفترخانہ سکرٹر اعظم۔ حکم
دیا جاتا ہے عرضی دینے والے کو کہ جواب اِس عرضی کا نواب گورنر
جنرل بہادر بعد دریافت کے ارشاد فرمائیں گے۔ از کیمپ لودھیانہ
۲۸ر جنوری ۱۸۶۰ء" یہاں کا یہ حال ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر آگرہ
سے مرادآباد آیا چاہتے ہیں۔ مرادآباد یہاں سے بارہ کوس ہے۔
نواب صاحب دورے کو اپنے ملک کے گئے ہیں دو چار دن میں
پھر آئیں گے۔ اگر اُن کی ملاقات کو مرادآباد جائیں گے میں بھی ساتھ

جاؤں گا۔ اگرچہ گورنر غرب و شمال کو دلّی سے کچھ علاقہ نہیں مگر دیکھوں کیا گفتگو درمیان میں آتی ہے۔ جو واقع ہوگا تمہیں لکھوں گا۔ یہ تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو۔ تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمہاری اُستانی جی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اِتنا نہیں ہوسکتا کہ جاؤ اور پڑھکر سُناؤ؟ اب اُن کو خیال ہوگا کہ اِس انگریزی خط میں کیا لکھا ہے۔ تم یہ خط میرا ہاتھ میں لئے جاؤ اور حرف بہ حرف پڑھ سُناؤ۔ لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں۔ کبھی مجھکو ستاتے ہیں۔ بکریاں۔ کبوتر۔ بٹیریں۔ تکّل۔ کنکوا۔ سب سامان درست ہے۔ فروری مہینے کے دو۔ دو روپیہ لیکر دس دن میں اُٹھا ڈالے۔ پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ دادا جان کچھ ہم کو قرضِ حسنہ دو۔ ایک روپیہ دونوں کو قرضِ حسنہ دیا گیا۔ آج ۱۴ ہے مہینہ دُور ہے۔ دیکھئے کے بار قرض لیں گے۔ یہاں کا رنگ نواب صاحب کے آنے پر جو ہوگا اور جو قرار پائے گا وہ مفصل تم کو لکھوں گا۔ اور تم اپنی والدہ کو سُنا دینا۔ اور ہاں بھائی یہ بھی گھر میں پوچھ لینا کہ کدارناتھ نے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی۔ میں نے تو وفادار اور حلال خوری تک کی بھی تنخواہ بھیجدی ہے۔

غالب سہ شنبہ ۱۴ر فروری سنہ ۱۸۶۰ء

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد

سال ولادت آپ کا ۱۸۳۰ء ہے آپ کے والد ماجد مولوی محمد باقر شرفائے دہلی سے تھے اور مذہب امامیہ میں اجتہاد کا مرتبہ رکھتے تھے۔ ۱۸۵۶ء میں پہلا اُردو اخبار آپ ہی نے دہلی سے شائع کیا تھا۔ آزاد نے دہلی کالج کے اورنٹیل ڈیپارٹمنٹ میں عربی اور فارسی تحصیل کی۔ اُردو شعر و سخن اور انشا پردازی کا ملکہ ان کو کالج ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ نظم میں اپنا کلام خاقانی ہند اُستاد ذوقؔ کو دکھاتے تھے۔ بعد غدر حیدرآباد دکن گئے وہاں سے لاہور پہونچے اور سررشتۂ تعلیم پنجاب میں ملازمت اختیار کی کچھ روز سرکاری اخبار کے اسسٹنٹ اڈیٹر رہے پھر پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی پنڈت من پھول صاحب کی رفاقت میں کابل اور بدخشاں کا سفر کیا۔ وہاں سے واپس آکر گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے ۱۸۸۶ء میں عازم سیاحت ایران ہوئے جس کا حوالہ آپ کی بعض کتابوں میں پایا جاتا ہے ۱۸۸۶ء میں آپ کو سرکار انگریزی نے شمس العلما کا خطاب عطا فرمایا۔ آپ کی ماں چونکہ ایک ایرانی خاتون تھیں۔ اس لئے آپ کو فارسی میں بامحاورہ

گفتگو کرنے کی مشق پہلے ہی سے تھی۔ علوم عربیہ اور فارسی ادبیات میں عبور حاصل ہونے کے سوا بھاشا اور زبان انگریزی سے بھی بیگانہ نہ تھے ۱۸۸۹ء میں دماغ خراب ہو گیا۔ جس کی اصلاح پھر نہ ہو سکی یہانتک کہ آپ نے شروع ۱۹۱۰ء میں اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔ اور لاہور میں مدفون ہوئے۔ نظم و نثر اُردو میں آپ کا طرز جداگانہ ہے۔ بلکہ جدید شاعری اور جدید انشاپردازی کی راہ میں چراغ ہدایت آپ ہی نے روشن کیا۔ نثر میں آزاد کی کتابیں دو قسم کی ہیں ایک وہ جو اُنھوں نے سرشتۂ تعلیم پنجاب کے لئے لکھیں مثلاً اُردو کا قاعدہ۔ اُردو کی پہلی دوسری تیسری اور چوتھی کتاب۔ قصص ہند فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب۔ جامع القواعد وغیرہ۔ دوسرے وہ کتابیں جو اُنھوں نے اپنے شوق سے لکھیں وہ حسب ذیل ہیں۔ آبحیات۔ دربارِ اکبری۔ سخندانِ پارس۔ نیرنگِ خیال۔ قندِ فارسی وغیرہ۔ ان میں سے تذکرہ آبحیات۔ دربارِ اکبری زیادہ مشہور اور مقبول ہیں نیرنگِ خیال میں انگریزی روش کا پرتو ہے۔ آبحیات کا طرزِ بیان سلاست زبان شستگی الفاظ۔ ولآویزی محاورات کے ساتھ ظرافت کی چاشنی اور جذبات شاعرانہ کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ نثر میں آزاد کی قادرالکلامی عموماً مسلم ہے۔ شوکت الفاظ۔ بلند پروازی خیالات

پنڈت رتن ناتھ در سرشار

پنڈت رتن ناتھ در سرشار محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے آخری عہد حکومت میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے ابتدائے سن میں فارسی اور عربی کی تعلیم پائی بعد ازاں زبانِ انگریزی کو بھی حاصل کیا لیکن آپ کو اردو زبان کی وسعت اور ترقی کا شوق تمام عمر دامنگیر رہا چند سال آپ انگریزی اسکولوں میں ماسٹر رہے ایک جغرافیہ کی کتاب شمس الضحیٰ نامی اُس زمانہ کی تصنیف ہے سنہ ۱۸۶۹ء میں منشی نولکشور کی قدر دانی سے پنڈت رتن ناتھ در اودھ اخبار کے اڈیٹر مقرر ہوئے اور اسی سال آپ نے اسی اخبار میں فسانۂ آزاد کی بنیاد ڈالی ۔ اردو میں فسانۂ آزاد سے پہلے کوئی ناول نہیں لکھا گیا تھا اور اس زبان میں ناول نویسی کا موجد سرشار کو سمجھنا چاہیئے علاوہ فسانۂ آزاد کے حضرت سرشار کی تصانیف میں سیرِ کہسار، جامِ سرشار کامنی وغیرہ بھی مشہور ہیں ۔ آپ کی زبان نہایت سلیس اور پاکیزہ ہے اور لکھنؤ کی بول چال کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے آپ کی تصنیفات میں لکھنؤ کی اسلامی تہذیب کے ہر پہلو کی تصاویر موجود ہیں ۔

آخر عمر میں حضرت سرشار حیدرآباد دکن میں مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے سایۂ عاطفت میں رہے اور سنہ ۱۹۰۶ء میں وہیں انتقال کیا۔ زمانہ قیام حیدرآباد میں آپ نے ایک رسالہ دبدبۂ آصفی نکالا تھا۔ حضرت سرشار اُردو میں شعر کہتے تھے اور اچھا کہتے تھے مگر ان کی شہرت بہ حیثیت نثار کے ہے ؎
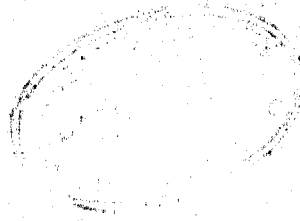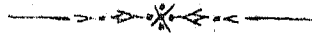
اقتباس از جامِ سرشار

اُٹھائی گیرا۔ لُقّا۔ لُچّا۔ شُہدا۔ دغاباز۔ جعلساز۔ گرہ کٹ۔ چور۔ اُچکّا۔
ڈاکو۔ بدمعاش۔ اوباش یہ سب بُرے مگر شرابی ان سب کا گرو گھنٹال
ہے کوئی شخص چاہے جعل بنانے میں میاں حسین بخش کے بھی کان
کاٹے مگر شرابی سے ہم اُس کو اچھا ہی سمجھیں گے۔ حالانکہ حسین بخش
نے ماشاءاللہ وہ نیکنامی حاصل کی ہے کہ اچھے اچھے جعلیے اُس کا نام
سُن کر اپنا کان پکڑتے ہیں۔ ڈکیتی میں کوئی کیسا ہی ظلم بپا کرے
لیکن ہمارے نزدیک شرابی سے وہ پھر بھی اچھا ہے۔ بدمعاش کیسا ہی
پرلے سرے کا کیوں نہ ہو شرابی پر اُس کو فضیلت ہے قس علیٰ ہذا
اُچکّوں کو بھی شرابی پر ترجیح ہے۔ شرابی یہاں پر ہم اُن حضرات سے
مراد لیتے ہیں جو شراب کے بندے ہیں اور بادہ گساری ہی کو دین و
ایمان سمجھتے ہیں۔ دن رات غلیں ہر دم سیہ مست۔ ہر وقت بادہ پرست
جب دیکھئے مخمور نشے میں چور یہ گرے وہ گرے۔

ع پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

گھر پر پینے سے انھیں عار نہیں۔ کلوار کی دُکان پر چُسکیاں اُڑاتے ہیں

انھیں انکار نہیں۔ سر بازار پی پی کر جھومنا اور گلی کوچوں میں لڑکھڑاتے ہوئے گھومنا عین وضعداری ہے جن کی عقل حلیۂ عاقبت سے عاری ہے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح تک یہی شغلِ مے خواری ہے۔

یہ وہ بلا ہے جو صدہا نوجوانوں کو ایسی چمٹی کہ پیرانہ سالی تک پیچھا نہ چھوڑا۔ عمر بھر اسی چڑیل سے ناتا جوڑا۔ لوگوں نے لاکھ سمجھایا۔ منہ نہ موڑا۔ توبہ شکنی رہی چھپر پر کبھی جام تک نہ توڑا۔ یہ وہ کالی ناگن ہے جس کا کاٹا منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے۔ لہر تک نہ آئے۔ کلوار کی دکان پر گچھی پی اور بازار میں گالیاں بکنے لگے کبھی بدر روؤں میں پڑے ہیں کبھی نالی میں لڑھک گئے یہ انواع و اقسام کی ذلت کی کان ہے مگر شرابی کی جان ہے۔ ؎

شرابِ کہنہ کہ روشنگرِ روانِ من است   مصاحبِ من و پیرِ من و جوانِ من است

ایک دفعہ منہ لگی بس پھر عمر بھر چھٹنا محال ہے۔ گھر جنجال ہو جائے زندگی وبال ہو جائے دین و دنیا دونوں کی خبر نہ رہے۔

ایسے عالی ظرف کم ہیں جو لیاقت کے ساتھ پئیں اور ہوش میں رہیں مگر ہاں کبھی پیتے اتنی کا حکم نہیں رکھتے۔ دن بھر خوب جم کر محنت کی شام کو دو تین جام پیے اعضاء رئیسہ کو قوت پہنچی آنکھوں میں لال لال ڈورے آئے سرور گٹھا۔ رنگ بہا محنت کی تکان دور ہوئی

کسل اور ماندگی کافور ہوئی۔ ؎

مے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است   بلکہ مے میشود از صحبت ناداں بدنام

حق یوں ہے کہ عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئے۔ ایسی شراب خوری کی ایسی تیسی کہ پی اور کیچڑ میں لت پت۔ ایسے شرابی پر خدا کی مار شیطان کی پھٹکار۔ شراب پی کر سرخوش و تر دماغ ہونا لازم ہے یا سیہ مست و خراب۔

اسی لت نے ہزاروں گھر ملائے۔ سیکڑوں نوجوان رنگین خاک میں ملائے اچھے اچھے جوانان رعنا اس کی بدولت کفن پوش ہوئے اجل سے ہم آغوش ہوئے۔ بھلے مانسوں کا دوالا اس نے نکالا ایسی کثرت مے نوشی کا منہ کالا۔ ؎

کیا ذکر شراب یار توبہ خاور   رہ ایسا نہ شرمسار توبہ خاور
دوزخ میں چلیں گے سب کہ پینے والے   توبہ خاور ہزار توبہ خاور

اسی سبب سے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب میں اس کے استعمال کی قطعی ممانعت ہے اہل ہنود میں برہمن چھتری ویش اس کو نہیں پی سکتے اور یوں تو بڑے بڑے مولانا اور باجپئی پئیں تو کیا یہ اور بات ہے۔

رسالہ تھیوسوفسٹ مطبوعہ جون سنہ ۱۸۸۰ء میں کسی انگریز کا ایک خط

جو صاحبِ ممدوح نے ہندوستان میں کسی بودھ مذہب والے کے پاس بھیجا تھا پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے لندن میں شراب خواری کی اس درجہ گرم بازاری ہے کہ اَلاَمان الحذر چھوٹے بڑے پڑھے بے پڑھے غریب وامیر برنا و پیر سب کے یہاں شرابی موجود ہیں۔ ایسے دھاوت پینے والے کہ بوتلوں کی بوتلیں اور قرابوں کے قرابے خالی کریں اور ڈکار تک نہ لیں۔ آدمی کیا شراب کی بھٹی ہیں اولڈ ٹام کا پیپہ ہیں خدا ایسے حضرات سے پناہ میں رکھے۔ ججوں اور مجسٹریٹوں کے بیان سے ظاہر ہوا کہ لندن میں ۹/۱۰ مقدمے ایسے آتے ہیں جو خاص کثرتِ بادہ گساری سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس اخبار کو پڑھئے جس رسالہ کو کھولئے جس میگزین کو دیکھئے یہ ضرور پایئے گا کہ شرابیوں نے اتنے آدمی حالت نشہ میں قتل کر ڈالے فلاں شخص نے شراب اس کثرت سے پی لی کہ مخمور وخراب ہو کر تین آدمیوں پر گولی سر کی دو زخمی ہوئے اور ایک راہی ملکِ بقا۔ اَلاَمان۔ اَلاَمان۔ تین شرابیوں نے مل کر فلاں کوٹھی میں چوری کی۔ گرفتار ہوئے تو غبین تھے۔

الغرض یہ شراب اُمّ الخبائث ہے۔ انواع واقسام کے گناہ اور جرائم اور برائیاں اس سے سرزد ہوتی ہیں۔

اور لطیفہ سنئے وہ لکھتے ہیں کہ اگر وہاں کی شراب کی دکانیں اور کوٹھیاں ایک قطار میں ہوں تو بہتر میل جگہ اُن کے لئے چاہیئے۔ معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔ توبہ۔ توبہ۔ بہتر میل کا فاصلہ سپاہی چوبیس گھنٹوں میں طے کرتے ہیں اور وہ بھی اُس حالت میں جب تیزی کے ساتھ لڑنے کے لئے فوج ڈبل مارچ کرتی جاتی ہے۔ کوئی چالیس برس کا عرصہ ہوا کہ لندن کے کاریگروں نے ایک جلسہ منعقد کیا اور کوشش موفور کی کہ شراب خواری کالعدم ہو جائے مگر اُن کی سعی مشکور نہ ہوئی پادریوں نے اُن کی مدد نہ کی کیونکہ وہ بھی عموماً شراب پیتے ہیں اور جن لوگوں کو مذہب کا خیال ہے اُنھوں نے پادریوں کے خوف سے اُن بیچاروں کا ہاتھ نہ بٹایا تاہم خدا کے اُن مقبول بندوں نے اپنی کوشش کو قائم رکھا اور استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا اب اُن کی رائے اور اُن کی سوسائٹی پر عوام بھی کسی قدر توجہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ شراب خواری کے لئے کوئی ایسا قانون نافذ ہو کہ اس کی کثرت اس قدر نہ رہے جس قدر اب ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اِس کثرت شراب خواری سے سرکار کی خوب بن آتی ہے کیونکہ اِس کا محصول کثرت سے آتا ہے۔

اِس کے بعد لکھا ہے کہ اگر مذہب بودھ کے چند پادری یہاں

بھیجو تو خوب بات ہو وہ لوگ یہاں آکر ہم کو سکھائیں اور بتائیں کہ
شراب خواری کیسی بلائے بے درماں ہے۔

بھئی واللہ بات تو خوب سوجھی۔ ادھر تو انگلستان اور امریکہ سے
پادری یہاں آئیں کہ اہلِ ہند کو چل کر راہِ نیک بتائیں اور ادھر ہمارے
ملک سے ہندوؤں اور بودھوں کے گرو انگلستان جائیں اور وہاں
کے لوگوں کو اپنے خیالات کے بموجب سیدھے ڈھرے پر چلائیں۔

الغرض شراب خواری کی مضرتیں اہلِ خرد پر مخفی نہیں رہ سکتیں
کوئی فردِ بشر ایسا نہیں جو کثرتِ بادہ گساری کو پسند کرتا ہو یا اس کی
توصیف میں دلائلِ عقلی پیش کر سکتا ہو ہاں دوا کے طریق پر پینا
اور اعتدال کا ہمیشہ خیال رکھنا عمدہ بات ہے۔ اس تمہید کے بعد
ہم اپنے ناظرین کو مضارِ شراب خواری کے ثبوت میں ایک داستان
عبرت توامان سناتے ہیں۔ اور بادہ گساری کی بیشمار خرابیوں کو
قصے کے پیرائے میں موبمو بتاتے ہیں +

سرسید احمد خاں

سرسید دہلی کے ایک معزز گھرانے میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ اِس خاندان کے اسلاف شاہانِ مغلیہ کے متوسل اور دست پروردہ تھے۔ سرسید علومِ رسمیہ سے فراغ حاصل کر کے کچھ دنوں دربارِ شاہی سے وابستہ رہے بعدازاں ۱۸۳۷ء میں سرکارِ انگریزی کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ پہلے دہلی کے صدر امین کی عدالت میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ پھر ۱۸۵۵ء میں بجنور کے مستقل صدر امین ہو گئے ایامِ غدر میں جب بجنور میں بھی شعلۂ بغاوت بلند ہوا تو آپ نے صاحبانِ انگریز کے ساتھ جو وہاں حاکم تھے پورے طور سے حقِ رفاقت اور جاں نثاری ادا کیا جب غدر فرو ہوا تو آپ مرادآباد کے صدرالصدور یعنی سب جج مقرر ہوئے اور ممالکِ مغربی و شمالی کے مختلف اضلاع میں اِسی عہدہ پر اُن کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ۱۸۶۹ء میں انگلستان تشریف لے گئے وہاں ڈیڑھ سال تک انواع اقسام کی معلومات اور تجربے حاصل کرتے رہے۔ خطباتِ احمدیہ آپ نے وہیں لکھی۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء میں

ولایت سے واپس آئے یہاں آکر جو سب سے اہم اور مفید قومی کام
اپنے ذمہ لیا وہ مدرسۃ العلوم مسلمانان قائم کرنے کا اہتمام تھا جس
کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ڈالی اور باقی عمر اُسی کی تکمیل
اور ترقی میں ہمہ تن کوشاں رہے یہاں تک کہ ۱۸۷۶ء میں پنشن
لیکر اپنی زندگی کو اپنی قوم کے لئے وقف کر دیا۔ بہادر شاہ کے
دربار سے آپ کو جوادالدولہ عارفِ جنگ کا خطاب تھا اور سرکار
انگریزی سے آپ کو کے سی ایس آئی کا خطاب اور تمغا عطا ہوا تھا۔
آپ نے بعمر ۸۱ سال ۱۸۹۸ء میں بمقام علی گڈھ رحلت فرمائی اور
کالج کمپاؤنڈ میں مدفون ہوئے۔

سرسید اپنے زمانہ کے مشہور ریفارمر تھے۔ مضامین اخلاقی اور علمی
اکثر لکھا کرتے تھے۔ مسلمانوں میں علمی شوق پیدا کرنے کے لئے آپ نے
تہذیب الاخلاق جاری کیا تھا۔ جو ادب۔ اخلاق۔ حکمت۔ اور تاریخی
مضامین کا مخزن تھا۔ علی گڈھ میں آپ نے علمی تحقیقات کے لئے
سینٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ سب سے آخر کوشش آپ کی محمڈن کالج
قائم کرنے کی تھی جس میں وہ پورے طور سے کامیاب ہوئے۔
پہلے پہل آپ نے دہلی کی مشہور عمارتوں کے حال میں آثار الصنادید
لکھی۔ اُس وقت آپ کا طرزِ تحریر پرانے رنگ ڈھنگ کا تھا۔

مگر سلاست اور بے ساختگی سے خالی نہ تھا۔ بعد غدر آپ نے وہ طرز اختیار کیا جس کو نیچرل انشاپردازی کہہ سکتے ہیں اور جس میں صنائع لفظی اور معنوی پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا ہے۔ تاہم سرسید اپنی تقریر اور تحریر میں بعض اوقات تشبیہہ اور استعارہ سے اور کبھی ضرب الامثال اور لطائف برجستہ سے وہ زور اور جادو پیدا کر دیتے تھے کہ سامعین و قارئین از خود رفتہ ہو جاتے تھے اردو زبان پر یہ اُن کا بڑا احسان ہے کہ اس کو منشیانہ تصنع اور تکلف سے پاک کیا اور لطافت و فصاحت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ مضمون نگاری کا جو سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے یہ سب اسی ایک قلم کی آوازِ بازگشت ہے۔ آپ کی علمی تصانیف میں خطبات احمدیہ۔ تفسیر القرآن۔ مضامین مندرجہ تہذیب الاخلاق۔ آثار الصنادید مشہور و معروف ہیں۔ آپ کی تالیفات میں یہ خوبی اور خصوصیت ہے کہ لطافت مضمون اور خیالاتِ پاکیزہ کے ساتھ معارفِ حکمیہ اور تحقیقاتِ علمی بھی موجود ہیں۔ علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں بھی اکثر آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔
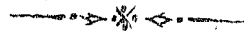
بحث و تکرار

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز اُن کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں۔ اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چِر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں مُنہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں۔ اور عنیف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اِس کا ہاتھ اُس کے گلے میں اور اُس کی ٹانگ اس کی کمر میں۔ اُس کا کان اس کے مُنہ میں اور اُس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اِس نے اُس کو کاٹا اور اُس نے اِس کو پچھاڑ کر بھنبوڑا۔ جو کمزور ہوا دُم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے پہلے صاحب سلامت کرکے آپس میں مل بیٹھتے ہیں پھر

دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ایک کوئی بات کہتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔یہ بولتا ہے تم کیا جانو دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے تیوری چڑھ جاتی ہے۔رُخ بدل جاتا ہے آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔باچھیں چر جاتی ہیں۔دانت نکل پڑتے ہیں تھوک اُڑنے لگتا ہے۔باچھوں تک کف بھر آتے ہیں سانس جلدی جلدی چلتی ہے رگیں تن جاتی ہیں۔آنکھ۔ناک۔بھوں۔ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔آستینیں چڑھا ہاتھ پھیلا۔اِس کی گردن اُس کے ہاتھ میں اور اُس کی ڈاڑھی اس کی مُٹھی میں لپاڈُکی ہونے لگتی ہے۔کسی نے بیچ بچاؤ کرکے چھڑا دیا تو غرّاتے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا ایک اُدھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی ؟

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اُسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے کہیں تُو تکار تک نوبت آجاتی ہے۔کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے۔مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے

کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے ۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اُس کے پرکھنے کے لئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے ۔ اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے ۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی ۔ محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہئے ۔

پس اے میرے عزیز ہموطنوں! جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو ۔ اگر ایک ہی مجلس میں دُو بدُو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو ۔ چہرہ ۔ لہجہ ۔ آواز ۔ وضع ۔ لفظ ۔ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور اشرافت ظاہر ہو مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو ۔ مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا یا شاید مجھے دھوکہ ہوا ۔ یا میں غلط سمجھا گو بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں ۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ یہ کہہ کر میں اس بات کو پھر سوچونگا ۔ یا اُس پر پھر خیال کروں گا ۔ جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی

باتیں کہہ کر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اُس دو تین دفعہ کی اُلٹ پھیر سے تمھارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمھارا مطلب باتوں کی اُس اُلٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا۔ کیونکہ جھگڑا یا شبہہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے۔ اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے*

جب کہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثہ کو آنے نہ دو کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی تو جس قدر جلد ممکن ہو اُس کو ختم کرو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ اُن کی مجلسوں میں آپس کے مباحثہ اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے*

اُمید کی خوشی

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک اے آسمان کے تاروں تمھاری خوش نما چمک۔ اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دُھندلی چوٹیو۔ اے پہاڑ کے عالی شان درختو۔ اے اُونچے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو۔ تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوش نما معلوم ہوتے ہو۔ اس لئے کہ ہم سے بہت دُور ہو۔ اِس دوری ہی نے تم کو یہ خوبصورتی بخشی ہے اِس دوری ہی سے تمھارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے ۔

وہ چیز کیا ہے۔ کیا عقل ہے جس کو سب۔ سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ کیا وہ ہم کو آیندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے ؟ ہرگز نہیں ۔ اُس کا میدان تو نہایت تنگ ہے۔ بڑی دَوڑ دھوپ کرے تو نیچر تک اُس کی رسائی ہے جو سب کے سامنے ہے ۔

او نورانی چہرہ والی یقین کی اِکلوتی خوبصورت بیٹی۔ اُمید۔ یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبت کے

وقتوں میں ہم کو تسلّی دیتی ہے۔ تُو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی بدولت نہایت دُور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی۔ خوشی کے لئے نام آوری۔ نام آوری کے لئے بہادری۔ بہادری کے لئے فیاضی فیاضی کے لئے محبت۔ محبت کے لئے نیکی۔ نیکی کے لئے تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں ٭

وہ پہلا گنہگار انسان جب شیطان کے چنگل میں پھنسا اور تمام نیکیوں نے اُس کو چھوڑا اور تمام بدیوں نے اُس کو گھیرا تو صرف تُو ہی اُس کے ساتھ رہی۔ تُو ہی نے اُس نا اُمید کو نا اُمید ہونے نہیں دیا۔ تُو ہی نے اُس موت میں پھنسے دل کو مرنے نہیں دیا۔ تُو ہی نے اُس کو اُس ذلّت سے نکالا اور پھر اُس کو اُسی اعلیٰ درجہ پر پہنچایا جہاں کہ فرشتوں نے اُس کو سجدہ کیا تھا ٭

اُس نیک نبی کو جس نے سینکڑوں برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت اُٹھائی اور مار پیٹ سہی۔ تیرا ہی خوبصورت چہرہ تسلّی

دینے والا تھا - وہ پہلا ناخدا جب کہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا - تو تو ہی اُس طوفان میں اُس کی کشتی کھینے والی اور اُس کا بیڑا پار لگانے والی تھی - تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے - زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہنچی جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے ؁

اے آسمانوں کی روشنی - اور اے ناامید دلوں کی تسلی اُمید - تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل ملتا ہے - تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے - تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے - عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈتا ہے وہاں کی ٹھنڈی ہوا خوش الحان جانوروں کے راگ بہتی نہروں کی لہریں اُس کے دل کو راحت دیتی ہیں - اُس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں - تمام فکریں دل سے دُور ہوتی ہیں اور دُور دراز زمانہ کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں ؁

دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے اُس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اُس گہوارہ کی ڈوری بھی

ہلاتی جاتی ہے ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے اور زبان سے
اُس کو یوں لوری دیتی ہے۔ سو رہ میرے بچے سو رہ۔ اے اپنے
باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سو رہ۔ اے میرے دل
کی کونپل سو رہ۔ بڑھ اور پھل پھول۔ تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پاوے۔
تیری ٹہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے۔ کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آوے۔
کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے۔ سو رہ میرے
بچے سو رہ۔ میری آنکھوں کے نُور اور میرے دل کے سُرور میرے
بچے سو رہ۔ تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا۔ تیری خصلت
تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی۔ تیری شہرت تیری لیاقت تیری
محبت جو تو ہم سے کرے گا آخر کار ہمارے دل کو تسلی دیں گی۔
تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اوجالا ہوگی تیری پیاری پیاری
باتیں ہمارے غم کو دور کریں گی۔ تیری آواز ہمارے لئے خوش آیند
راگنیاں ہوں گی۔ سو رہ میرے بچے سو رہ۔ اے ہماری امیدوں
کے پودے سو رہ۔ بولو جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جاویں گے
تو تم کیا کروگے۔ تم ہماری بے جان لاش پاس کھڑے ہوگے۔
تم پوچھوگے اور ہم کچھ نہ بولیں گے۔ تم رووگے۔ اور ہم کچھ رحم
نہ کریں گے۔ اے میرے پیارے رونے والے۔ تم ہمارے ڈھیر

اگر ہماری روح کو خوش کرو گے۔ آہ ہم نہ ہوں گے اور تم ہماری
یادگاری میں آنسو بہاؤ گے۔ اپنی ماں کا محبت بھرا چہرا اپنے باپ
کی نورانی صورت یاد کرو گے۔ آہ ہم کو بھی رنج ہے کہ اُس وقت
ہماری محبت یاد کر کے تم رنجیدہ ہو گے۔ سو رہ میرے بچے سو رہ۔ سو رہ
میرے پیارے سو رہ ۔

یہ اُمید کی خوشیاں ماں کو اُس وقت تھیں جب کہ بچہ غوں غاں
بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے
اپنی ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور امّاں امّاں کہنا سیکھا اُس کی
پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اُس کی ماں کے کان میں پہنچنے
لگی۔ آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل
ہوا۔ پھر مکتب سے اُس کو سروکار پڑا۔ رات کو اپنی ماں کے سامنے
دن کا پڑھا ہوا سبق غم زدہ دل سنانے لگا۔ اور جب کہ وہ تاروں
کی چھاؤں میں اُٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح
کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل سے بے گناہ زبان
سے بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو اُمید کی خوشیاں
اور کس قدر زیادہ ہو گئیں۔ اُس کے ماں باپ اُس معصوم سینے
کی ہمدردی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں۔ اور ہماری پیاری

اُمید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے ؞

دیکھو وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے اُس کا
پیارا بیٹا بھیڑوں کے ریوڑ میں سے غائب ہو گیا ہے۔ وہ اُس کو ڈھونڈتا
ہے پر وہ نہیں ملتا۔ مایوس ہے پر اُمید نہیں ٹوٹی۔ لہو بھرا دانتوں
پھٹا کرتا دیکھتا ہے پر ملنے سے نا اُمید نہیں۔ فاقوں سے خشک ہے۔
غم سے زار نزار ہے روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئی ہیں کوئی خوشی
اُس کے ساتھ نہیں ہے۔ مگر صرف ایک اُمید ہے جس نے اُس کو
وصل کی اُمید میں زندہ [illegible] اُس خیال میں خوش رکھا ہے ؞

دیکھ وہ بے گناہ قیدی اندھیرے کنوئیں میں سات تہ خانوں
میں بند ہے اُس کا سورج کا سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے۔ بے یار
و دیار غیر قوم غیر مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے بڈھے
باپ کا غم اُس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ عزیز بھائی کی جدائی
اُس کے دل کو غمگین رکھتی ہے۔ قید خانہ کی مصیبت اُس کی تنہائی
اُس گھر کا اندھیرا اور اُس پر اپنی بے گناہی کا خیال اُس کو نہایت
ہی رنجیدہ رکھتا ہے اُس وقت کوئی اُس کا ساتھی نہیں ہے مگر
اپنے ہمیشہ زندہ رہنے والی اُمید۔ تجھی میں اُس کی خوشی ہے ؞

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ

کرتے کرتے تھک گیا ہے ہزاروں خطرے درپیش ہیں مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے۔ لڑائی کے میدان میں جبکہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں۔ اور لڑائی کا میدان ایک سُن سان کا عالم ہوتا ہے۔ دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے اور جبکہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے اور وہ آنکھ اُٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے۔ اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اُس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں۔ اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سُنتا ہے۔ اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اسے بہادروں کی قوت بازو۔ اور اسے بہادری کی ماں۔ تیرے ہی سبب سے فتحمندی کا خیال اُن کے دلوں کو تقویت دیتا ہے۔ اُن کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سُنتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر وقت بھلائی کی تدبیریں

ڈھونڈتا ہے۔ اُن کی تلاش میں دُور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے۔ بیگانوں بیگانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈتا ہے۔ مشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے اُنھیں کو دشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتاتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے فتوؤں کا ڈر دکھاتے ہیں بھائی بند عزیز اقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں ؎

وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں

بھائی سیّد تو کچھ دیوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں مگر ہاں ہاں کر کے محنت اور دلسوزی سے دُور رہ کر۔ بہت سی ہمدردی کرتے ہیں۔ پر کوٹھی کٹھلے سے الگ کر کر۔ دل ہر وقت بیقرار ہے۔ کسی کو اپنا سا نہیں پاتا۔ کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔ مگر اے بیقرار دلوں کی راحت اور ملے شکستہ خاطروں کی تقویت۔ تُو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے تُو ہی ہمارے دل کی تسلّی ہے تُو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے تیری ہی تقویت سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچیں گے۔ تیرے ہی سبب گوہرِ مراد کو پاویں گے۔ اور ہمارے دل کی عزیز اور

ہمارے پیارے مہدی کی پیاری "اُمید" تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلّی رہ، اے ہمیشہ زندہ رہنے والی اُمید جب کہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی۔ رنگ فق ہو جاتا ہے مُنہ پر مُردنی چھا جاتی ہے ہوا ہوا میں۔ پانی پانی میں۔ مٹّی مٹّی میں ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے ٭

اُس وقت اُس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے تیری صدا کان میں آتی ہے۔ اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی اُمید ہوتی ہے ٭

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لئے موسمِ بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہو جاتا ہے۔ اُس لازوال آنے والی خوشی کی اُمید تمام دنیاوی رنجوں اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے۔ اور غم کی شام کو خوشی کی صبح سے بدل دیتی ہے گو کہ موت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوفناک چیز ہے ٭

اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے جہاں سورج کی کرن اور زمانہ کی آہٹ بھی نہیں پہنچی تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے ایمان کے توشہ اور اُمید کے ہادی اور موت کی سواری سے مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے جس کا پیارا نام "اُمید" ہے ؛

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ اُمید نہیں ہوتی۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے وہ اپنے اُس بے تکلیف آنے والے زمانہ کی اُمید میں نہایت بردباری سے اور رنجوں کے زمانہ کے اخیر ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے ؎

بقدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مُردن

سولزیشن یا تہذیب

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن کیا چیز ہے اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے؟ یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصلاح ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے؟ یا یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مفہوم۔ اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہئے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطرتی چیز ہے تو وحشیوں میں۔ شہریوں میں۔ سب میں اس کا نشان ملے گا۔ گو اس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں۔ الا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطرتی بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے۔ اور کسی کو ناپسند۔ یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھیراتا ہے اور کسی چیز کو برا۔ اور اس کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اس بری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے

تبدیل کرے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے جو انسانوں کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے اسی تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہشِ تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطرتی ہے*

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت مائل ہونے کے دو اصول ٹھیرے۔ اچھا۔ اور برا۔ اور برے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھیری۔ مگر اچھا اور برا قرار دینے کے مختلف اسباب خلقی اور خُلقی۔ ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور برا ٹھیرنے میں۔ یا یوں کہو کہ قوموں کی سولزیشن میں اختلاف پڑجاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے۔ دوسری قوم اُسی بات کو بہت برا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے۔ اشخاص میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ جبکہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر اُن کی ضرورتیں اور اُن کی حاجتیں۔ اُن کی غذائیں اور اُن کی پوشاکیں۔ اُنکی معلومات اور اُن کے خیالات۔ اُن کی مسرت کی باتیں۔ اور اُن کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں۔ اور اسی لئے

بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب یکساں پیدا ہوتے ہیں۔ اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے۔ اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اِس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے مگر جب کہ مختلف گروہیں مختلف مقامات میں بستی ہیں۔ تو اُن کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اور اِس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہو گی کہ جو سولزیشن کی اُن مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے +

مُلکی حالتیں۔ جہانتک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں۔ نہ فکر اور خیال اور دماغ سے اُن کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں۔ بلکہ صرف انسان کے خیال کو اُس سے تعلق ہے جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھیر آتا ہے۔ اور جس باعث سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے۔ اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے جو سولزیشن کہلاتا ہے۔ پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں جن کے سبب سے اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے +

اچھے اور بُرے کی جگہہ میں اور لفظ کا استعمال کروں گا یعنی پسند اور ناپسند۔ انگریزی میں ایک لفظ "ٹیسٹ" ہے جو نہایت وسیع

معنوں میں مستعمل ہوتا ہے ہماری زبان میں بھی اُس قسم کے لفظ ہیں۔ جیسے کہ مزا یا مذاق۔ مگر وہ استعمال میں ایسے خاص ہو گئے ہیں کہ اُن سے وہ عام اور وسیع معنی خیال میں نہیں آتے۔ اس واسطے میں اُس لفظ کا ترجمہ "پسند" کرتا ہوں۔ پس پسند کا صحیح ہونا۔ جو خیال کے صحیح ہونے کی فرع ہے۔ بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے تصفیہ کا ہے۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرتِ معلومات پر اور علم طبعیات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ آیندہ کوئی ایسا زمانہ آوے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی وہ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنے سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مودّب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب۔ یا یوں کہو کہ بُری حالت سے اچھی حالت میں لانا۔ دنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہو یا مادّی۔ یکساں تعلق رکھتا ہے۔ اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسایش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اُس کو ترقی

دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زرو جواہر۔ یاقوت و الماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرایش کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرایش میں سونے چاندی۔ مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پروں کو۔ تیلیوں پر سے چھلے ہوئے سنہری پوست۔ اور زمرد کے سے رنگ کی باریک اور خوش نما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے۔ ناتربیت یافتہ قومیں بھی اُس کی دُرستی پر مصروف ہیں شاہی مکانات۔ نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور اُن کے رہنے کے کھوپچے درختوں پر باندھے ہوئے ٹانڈ۔ زمین میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں۔ تمدن کے قاعدے عیش و عشرت کی مجلسیں۔ خاطر اور مدارات کے کام اور اخلاق و محبت کی علامتیں دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں

خالی نہیں۔ بلکہ بعض چیزیں اُن میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے۔ ناتربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی وخوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے ان کی ادا اور آواز کی پھرت اُس کا گھٹاؤ اور اُس کا بڑھاؤ اُس کا ٹھیراؤ اور اُس کی اُونچ۔ ہاتھوں کا بھاؤ اور پاؤں کی دھمک۔ زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں وہ سُے اور تال۔ راگ وراگنی کو نہیں جانتے۔ مگر دل کی لہر اُن کی لَے۔ اور دل کی پھڑک اُن کا تال اُن کا غول باندھ کر کھڑا ہونا۔ طبعی حرکت کے ساتھ اُچھلنا۔ دل کی بیتابی سے جُھکنا اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا۔ گو نزاکت اور فنِ خنیاگری سے خالی ہو۔ مگر قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے۔ دلی جذبوں کا روکنا اور اُن کو عمدہ حالت میں رکھنا۔ تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے۔ پس جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں

اِسی طرح اُس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں جس چیز میں کہ ترقی یعنی بُرائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ کی طرف تحریک ہو سکتی ہے اُسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔ پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے انسان کے افعال اِرادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنا اور اُن کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریق تمدّن اور علوم وفنون کو بقدرِ اِمکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہنچانا۔ اور اُن سب کو خوش اسلوبی سے برتنا۔ اور اُس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت۔ اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے ؛

اس تہذیب کے حاصل ہونے کے بقول مسٹر ایچ۔ ٹی بکل صاحب چار اصول ہیں ؛

اوّل۔ جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں۔ اور جن کا سبب ہم کو معلوم نہیں ہوتا اُن کے سببوں اور قاعدوں کو دریافت کرنا۔ اور اُن کے علوم کو پھیلانا۔ پس جس قدر کامیابی اس میں ہوگی اُسی قدر انسان کی ترقی ہوگی ؛

دوم - اِس تحقیقات سے پہلے تجسُس کا خیال پیدا ہونا چاہیئے۔ جس سے ابتدا میں تحقیقات کو مدد ملتی ہے اور بعد کو تحقیقات سے اُس کی استعانت ہوتی ہے ＋

سوم - جو باتیں اس طرح پر دریافت ہوتی ہیں وہ عقلی باتوں کے اثر کو زیادہ کرتی ہیں - اخلاق کی باتوں کو کسی قدر کم - مگر اخلاق کی باتیں بہ نسبت اصلی باتوں کے زیادہ مستقل ہیں - اور اُن میں کمی بیشی بہت کم ہوتی ہے ＋

چہارم - اِس تحریک کا بڑا دشمن - جو درحقیقت سِولِزیشن کا بھی سخت دشمن ہے یہ خیال ہے کہ جب تک زندگی کے امورات کی نگرانی ہر طرح پر سلطنت اور مذہب سے نہو نسبتاً تک انسان کے گروہ کی ترقی نہیں ہو سکتی - یعنی سلطنت رعایا کو یہ سکھلاوے کہ اُن کو کیا کرنا چاہیئے - اور مذہب یہ سکھلاوے کہ کس بات پر یقین کرنا چاہیئے ＋
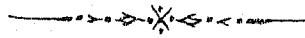
شمس العلما مولنا حافظ نذیر احمد دہلوی

آپ کا وطن اصلی من مضافات نگینہ ضلع بجنور رہے ۱۸۳۶ء میں وہیں پیدا ہوئے پہلے اپنے والد ماجد مولوی سعادت علی صاحب کے ہمراہ خاص شہر بجنور میں قیام پذیر تھے مگر سن تمیز کو پہونچکر دہلی آئے اور پھر وہیں مستقل قیام اختیار کر لیا۔ آپ نے فارسی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولوی نصراللہ خاں اور مولوی عبدالخالق صاحب سے پڑھیں ۱۸۴۵ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ کالج سے نکلنے کے بعد پہلے مدرّسی کی پھر کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے غدر کے بعد الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر رہے۔ انگریزی زبان بھی بقدر ضرورت سیکھ لی۔ آپ نے گورنمنٹ کے حکم سے تعزیرات ہند کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا جس کے صلہ میں آپ کو ۱۸۶۱ء میں کانپور کی تحصیلداری ملی۔ بعد اس کے آپ نے ضابطہ فوجداری اور قانون شہادت کا ترجمہ کیا۔ اس خدمت کے صلہ میں آپ ۱۸۶۳ء میں کانپور کے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ وہاں سے دیگر اضلاع میں تبدیل ہوتے رہے۔ نواب محسن الملک اور نواب عماد الملک بلگرامی

کی تحریک سے سر سالار جنگ نے ۱۸۷۷ء میں آپ کو حیدر آباد طلب فرمایا وہاں جاکر ایک ہزار تنخواہ اور دو سو چالیس روپیہ ماہواری الاؤنس کے ایک معزز عہدہ پر مقرر ہوئے۔ وہاں سے بعزت و احترام سبکدوش ہوئے۔ اور دہلی واپس آکر خانہ نشین ہوگئے ۲۸ راپریل ۱۹۱۲ء کو آپ نے اِس دنیا سے سفر کیا۔ آپ کی زبان دہلی کی ٹکسالی اُردو کا نمونہ ہے آخر وقت تک تالیف و تصنیف سے آپ کا قلم نہیں رُکا۔ اُردو لٹریچر کا کافی سرمایہ آپ کی تالیفات سے بہم پہونچ سکتا ہے اکثر کتابیں آپ نے تعلیم اور تہذیبِ نسواں کے متعلق لکھی ہیں آپ کی تقریر خاصکر مذہبی اور قومی جلسوں میں نہایت پُر زور پُر جوش اور لطایف و ظرایف سے بھری ہوتی تھی۔ امثال و محاورات کا استعمال زیادہ کرتے تھے چونکہ زبانِ عربی سے زیادہ مناسبت تھی اِس لئے آپ کے اُردو کلام میں عربی زبان کے الفاظ۔ فقرے اشعار۔ احادیث۔ اور آیاتِ قرآنی کا استعمال زیادہ پایا جاتا ہے۔ آپ کی تالیفات سے مندرجہ ذیل کتابیں یادگار ہیں۔ منتخب الحکایات۔ چند پند۔ توبۃ النصوح۔ مرأۃ العروس۔ بنات النعش۔ ابن الوقت۔ محصنات۔ رویائے صادقہ۔ الحقوق و الفرائض۔ اِس کے علاوہ بہت سے لکچر اور اسپیچیں

آپ کی چھپ گئی ہیں اور بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اکثر کتابیں آپ کی گورنمنٹ کی نظر میں بہت مفید ثابت ہوئیں جس کے صلہ میں آپ کو نقد روپیہ سرکار سے ملا۔ قرآن مجید کا ایک فصیح اور بامحاورہ ترجمہ آپ نے لکھا ہے۔
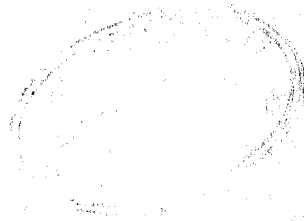
کلیم اور مرزا ظاہر دار بیگ

(ماخوذ از توبۃ النصوح)

کلیم شیخ چلّی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہونچا ہرچند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکمّے بے فکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پہ دستک دی تو جواب ندارد۔ اِس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا وہ بھی حقیقی نہیں ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اوّل تو ایسی عالی جاہ سرکار دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار تیسرے اُن دنوں کی بے عنوانی اِس پر خود اُس کی رشوت ستانی بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد دہلی کے رؤداروں میں ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوائلِ عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے باوجودیکہ دُور کی قرابت تھی حسبۃً للّٰہ اس کا تکفّل اپنے ذمّے لیا۔ جمعدار اپنی جینِ حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اُس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہو گی لیکن جمعدار کے مرنے پر

اِس کے بیٹے پوتے نواسے کثرت سے تھے انھوں نے بے اعتنائی
کی۔ اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وجیہت کر مرے تھے مگر اُن کے ورثا نے
بہ ہزار دقت محل سرائے کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے
رہنے کو دیا۔ اور سات روپیہ مہینہ کی کرایہ کی دُکانیں مرزا کے نام کر دیں
یہ تو حال تھا کہ مرزا مرزا کی ماں مرزا کی بیوی تین تین آدمی اور سات
روپیہ کی کُل کائنات اِس پر مرزا کی شیخی اور نمود یہ مسخرہ اس ہستی پر
چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے جن کو صدہا روپیہ
ماہوار کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اُس کو منہ نہیں لگاتے
تھے مگر یہ بے غیرت زبردستی اُن میں گھستا تھا یہ کسی کو بھائی جان
کسی کو ماموں جان کسی کو خالو جان بناتا اور وہ لوگ اِس کے ادعائی
رشتوں ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں
میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبون تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی اس نے
تمام عادتیں امیرزادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں مگر امیرزاد گی
نبھتی تو کیسے نبھتی دُکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں ماں بیچاری
بہتیرا بکتی مگر کون سنتا تھا مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے
کی جوتی سر پر دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی بدن میں ایک
چھوڑ دو دو انگرکھے اوپر شبنم یا ہلکی سی تنزیب نیچے کوئی طرحدار کا سا

ڈھاکے کا نینو۔ جاڑا ہوا تو بانات مگر سات روپیہ گز سے کم کی نہیں ۔
خیر یہ تو صبح شام اور تیسرے پہر کا شانی مخمل کی آصف خانی جس میں
حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی سُرخ
نیفہ کا پائجامہ اگر ڈھیلے پائنچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا
کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے اور اگر تنگ مُہری کا
ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا
ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اُس میں بے قفل کی کُنجیوں
کا گچھا۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب اِس ہیئت کذائی سے چھبیلا بنے
ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں کلیم سے اور مرزا سے
محفلِ مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے
مکان پر تشریف لانے لگے یہاں تک کہ چند روز سے تو دونوں
میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی کہ گویا یک جان دو قالب تھے کلیم کو
تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو
تو کبھی کبھی لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام تمام دن کلیم کے پاس
رہتے۔ مرزا نے اپنا حالِ اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم بھی
جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی محل سرا کو
مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ

اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اور اسی
غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محل سرائے کی ڈیوڑھی
پر جاموجود ہوا بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو
لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں اور ان میں سے ایک نے
پوچھا کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے۔ **کلیم**۔ جاؤ
مرزا کو بھیجدو۔ **لونڈی** کون مرزا۔ **کلیم**۔ مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان
ہے اور کون مرزا۔ **لونڈی** یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے اتنا کہہ
قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرلے جلدی سے کلیم نے کہا کیوں جی
کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے؟ **لونڈی**۔ ہے کیوں نہیں۔
پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں کیا ظاہر دار بیگ
جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟ **لونڈی**۔ جمعدار کے وارثوں
کو خدا سلامت رکھے۔ مرزا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا
کون ہوتا ہے۔ **دوسری لونڈی**۔ ارے کم بخت یہ کہیں مرزا باسکے
کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بنایا
کرتا ہے۔ (کلیم کے طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار
بیگ نا جن کی رنگت زرد زرد ہے۔ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دبلا
ڈیل۔ اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں **کلیم**۔ ہاں ہاں

وہی ظاہر دار بیگ۔ لونڈی۔ تو میاں اِس مکان کے پچھواڑے سے
اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچّا مکان ہے وہ اُس میں رہتے
ہیں۔ کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب تنگ
دھڑنگ جانگھیا پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھکر شرمائے
اور بولے آہا آپ ہیں معاف کیجئے گا میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں
بندے کو کپڑا پہنکر سونے کی عادت نہیں میں ذرا کپڑے پہن آؤں
تو آپ کے ہم رکاب چلوں کلیم۔ چلئے گا کہاں میں آپ ہی کے
پاس تک آیا تھا۔ مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تک تشریف رکھنا منظور ہو تو
میں اندر پردہ کرا دوں کلیم۔ میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں
رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔ مرزا۔ بسم اللہ۔ تو چلئے اسی مسجد میں
تشریف رکھئے بڑی فضا کی جگہ ہے میں ابھی آیا۔ کلیم نے جو مسجد میں
آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پُرانی چھوٹی سی مسجد ہے وہ بھی
مسجد ضرار[1] کی طرح ویران وحشت ناک نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلّا نہ طالب علم
نہ مسافر ہزار ہا چمگدڑیں اُس میں رہتی ہیں کہ اُن کی تسبیح سے بے ہنگام

[1] پیغمبر صاحب کے وقت میں بعض لوگوں نے ضد میں آکر دوسری مسجد کو اُجاڑنے کے
لئے ایک مسجد بنائی تھی پیغمبر صاحب نے اُسے ڈھوا دیا۔

کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرے سخے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے مرزا صاحب بطور دفعِ دخلِ مقدمہ فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ خفقان کا عارضہ اختلاجِ قلب کا روگ ہے اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو اُن کو غشی میں پایا اِس وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے یہ تو فرمائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ کلیم نے باپ کی طلب اپنا انکار بھائی کی اِلتجا ماں کا اِصرار تمام ماجرا کہہ سنایا۔ **مرزا۔** پھر اب ارادہ کیا ہے؟ **کلیم۔** سوائے اِس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا اِرادہ تو نہیں ہے اور جو آپ کی صلاح ہو۔ **مرزا۔** خیر نیّتِ شب حرام صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف استراحت فرمائیے میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اُس کی علالت میں اِشتداد ہے۔ **کلیم۔** یہ ماجرا کیا ہے تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں متعدد دیوان خانے کئی پائیں باغ ہیں حوض اور حمام اور کٹہرے اور

گنج اور دکانیں اور سرائیں۔ میں تو جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی
چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو یا یہ حال ہے کہ ایک
متنفس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ میسر نہیں جو جو حالات
تم نے اپنی زبان سے بیان کئے اُن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار
کے تمام ترکہ پر تم قابض اور متصرف ہو۔ لیکن میں اُس تمام جاہ و حشمت
کا ایک شمّہ بھی نہیں دیکھتا۔ مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی
کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے اتنی مدت مجھ سے اور آپ سے
صحبت رہی مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور میری عادت
کو نہ پہچانا۔ یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے
بندے کو جمعدار صاحب مرحوم مغفور نے متبنیٰ کیا تھا اور اپنا
جانشین کر مرے تھے شہر کے کل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ
ہیں اُن کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں
کیں بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے۔
صحبت ناملایم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ
بندوبست کا حوصلہ نہیں اُسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی
ہے اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منا
لے جائیں کلیم۔ لیکن آپ نے کبھی اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔ مرزا

اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت و حمیت سے بے نصیب ٹھیرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بچھوا دوں اور مریضہ کی تیمار داری کروں کلیم۔ خیر مقام مجبوری ہے لیکن پہلے ایک چراغ تو بھجوا دیجئے تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔ مرزا۔ چراغ کیا میں نے تو لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گرمی کے دن ہیں پروانے بہت جمع ہو جاویں گے اور آپ زیادہ پریشان ہوجیئے گا اور اس مکان میں ابابیلوں کی بہت کثرت ہے روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔ کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اُس نے کھانے کی مطلق پروانہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود ہی پوچھیں گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کے نسبت پوچھنا ضرور تھا کیونکہ اوّل تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی دوسرے یہ کہ اُس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی لیکن مرزا قصداً اُس بات سے متعرض ہی

نہ ہوا اور کلیم بیچارے کا بھوکھ کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے
پہلے اُس کی انتڑیوں نے قُل ہُو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔
جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب
تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بیچارے نے بے غیرت
بن کر خود کہا کہ سُنو یار میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ مرزا۔ سچ کہو نہیں
جھوٹھ بہکاتے ہو۔ کلیم۔ تمہارے سر کی قسم میں بھوکھا ہوں۔
مرزا۔ مردِ خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا اب اتنی رات گئے کیا
ہو سکتا ہے۔ دُکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک دُکان کھلی
بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی جن کے کھانے سے فاقہ
بہتر۔ گھر میں تو آج آگ تک نہیں سُلگی۔ مگر ظاہراً تم سے بھوک کی
سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمّت
والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی
بھڑ بھُونجے کے یہاں سے گرما گرم خستہ چنے کی دال بنوا لاؤں۔
بس ایک دھیلے کی مجھکو اور تم کو دونوں کو کافی ہو گی رات کا وقت
ہے ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اُٹھ باہر گئے
اور چشم زدن میں چنے بھُنوا لائے مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے یا تو کم
کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکّے لگائے اِس واسطے کہ کلیم کے روبرو

دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔ مرزا۔ یار ہو بڑے خوش قسمت
کہ اِس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ دیکھو تو کیسے بھو بس
رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجب ہی دلفریب ہے کہ
بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر
نکالا مگر بھوسنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔
کوئی فن ہو کمال بھی کیا چیز ہے دیکھئے اتنی تو رات گئی ہے مگر چھدامی
کی دُکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے بندے نے تحقیق سُنا ہے کہ حضور والا
کے خاصہ میں چھدامی کی دُکان کا چنا بلاناغہ لگ کر جاتا ہے اور واقعہ
میں ذرا آپ غور سے دیکھئے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوسنے میں چنوں کو
سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمھیں میرے سر کی قسم سچ کہنا۔ ایسے
خوبصورت خوش قطعہ سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے۔
دال بنانے میں اُس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ پر خراش تک
نہیں ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور اور دانوں کی رنگت دیکھئے کوئی
بسنتی ہے کوئی پستئی غرض دونوں رنگ خوشنما یوں صدہا قسم
کے غلّے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں لیکن چنے کی لذّت کو کوئی
نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریفت کی حکایت سُنی ہے۔ کلیم۔ فرمایئے
مرزا۔ چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو ارزاقِ عباد

کا اہتمام سپرد ہے فریاد لیکر گیا کہ یا حضرت ہیں نے ایسا کیا قصور کیا ہے
کہ جیوں جیوں میں سلتے زمین سے سر باہر نکالا تیر ستم چلنے لگا ماکولات
اور بھی ہیں مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی پر نہیں ہوتے نشو نما
کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر
آدمی ساگ بناتے اور سب پتے کو کھا جاتے ہیں جب بار آور ہوا تو
خدا جھوٹھ نہ بلوائے آدمی بکرے بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے
ہیں اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کئے پکا تو شاخ و برگ
بھس بنکر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخِ شکم کا ایندھن ہوا رہا دانہ
اس کو چکی میں دلیں گھوڑوں کو کھلائیں بھاڑ میں بھونے بیسن
بنائیں کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں گھونگھنیاں پسائیں غرض شروع
سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت
میکائیل کے دربار میں اس طرح پر بیباکانہ چپڑ پٹر بولنا سن کر
حاضرینِ دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اس کے کھانے
کو دوڑا چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظار حکم اخیر رخصت ہوا سو حضرت
یہ چنے ایسی لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندانِ آز ابھی ان پر
تیز ہیں افسوس کہ اس وقت تک مرچ بہم نہیں پہونچ سکتا ورنہ
میر مدو کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں۔ غرض مرزا

اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔ کلیم بھوکھا تو تھا ہی اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزیدار معلوم ہوئے مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیجدیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے یا تو خلوت خانے اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آکر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا حال ہم نے تھوڑا سا اوپر بیان کیا۔ گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے نہ چراغ نہ چارپائی نہ بہن نہ بھائی نہ مونس نہ غمخوار نہ نوکر نہ خدمت گار مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانہ میں حاکم کا گنہگار یا قفس میں مرغ نو گرفتار اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہہ پکڑتا اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا اور اُسی وقت نہیں تو سویرے گجردم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوجھنے کو تھے۔ اُس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں طیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔ صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلّے کا کوئی اور عیار ٹوپی جوتی رومال چھڑی تکیہ دری یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اُس کے جسم سے جدا تھی سب لے کر چمپت ہوا۔

یوں بھی کلیم بہت دیر کر سوتا اُٹھتا تھا اور آج تو ایک وجہ خاص تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرش مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لیں ہیں تو سیروں گرد کا بھبھوت اور چمگدڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھوپا ہوا ہے حیران ہوا کہ قلب ماہیّت ہو کر بَس کہیں بُھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا کہیں پتہ نہیں مسجد تھی ویران اُس میں پانی کہاں صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ اِدھر کو آ نکلے تو اُس کے ہاتھ مرزا کو بُلواؤں۔ یا مُنہہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔ اس میں دوپہر ہونے آئی بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا جو نہیں زینہ پر چڑھا تو کلیم اُس سے عرض مطلب کرنے کے لئے لپکا وہ لڑکا اُس کی ہیئت کذائی دیکھ ڈر کر بھاگا خدا جانے اِس لئے اُس کو بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقہ سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو اُلّو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا سیدھا مرزا کے مکان پر گیا آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو مُنہہ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پُرانی جوتی اور ٹوپی تاکہ کسی طرح

گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جاے۔ یہ سوچ کر اُس نے کہا کہ
کیوں حضرت آپ مجھ سے بھی واقف ہیں اندر سے آواز آئی ہم تمھاری
آواز تو نہیں پہچانتے اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔ کلیم۔ میرا نام
کلیم ہے۔ اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے۔
بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کے وجہ سے مسجد میں تھا گھر والے۔
وہ دری و تکیہ کہاں ہے جو رات تمھارے سونے کے لئے بھیجا گیا
تھا۔ تکیہ و دری کا نام سُن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے
میں متامل تھا کہ اندر سے آواز آئی مرزا زبردست بیگ دیکھنا یہ
مردوا کہیں چل نہ دے دوڑ کر تکیہ دری تو اِس سے لو۔ کلیم یہ
بات سن کر بھاگا ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست
نے چور چور کر کے جا لیا ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ
اپنے حقوقِ معرفت ثابت کئے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر اُس نے
ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔

——— ✻ ———

شمس العلما خواجہ الطاف حسین - حالی -

آپ پانی پت ضلع کرنال کے انصاری خاندان سے تھے۔ مورثِ اعلیٰ اِس خاندان کے عہدِ شاہی میں ہرات سے آکر پانی پت میں قیام پذیر ہوئے۔ ۱۸۳۷ء میں آپ وہیں پیدا ہوئے۔ فارسی۔ عربی کی کتابیں وطن ہی میں پڑھیں۔ بعد ازاں دہلی میں آکر منطق اور فلسفہ کی تکمیل کی۔ ابتدا میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے لڑکوں کی تعلیم کے لئے مامور ہوئے۔ نواب صاحب خود ذی علم اور شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ حالی بھی اپنا کلام نواب صاحب کو دکھاتے رہے۔ اس کے بعد آپ مرزا نوشہ کے شاگرد ہوئے۔ غالب نے آپ کی طبیعت کو شعر سے مناسب پاکر اس طرف توجہ اور ہمت دلائی۔ اِس کے بعد آپ نے دہلی کے اینگلو عربی اسکول میں مدرسِ فارسی کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ اُس وقت آپ کے اشعار میں ایشیائی شاعری کا رنگ تھا۔ بعد ازاں جب پنجاب بک ڈپو لاہور میں کتابوں کی عبارت زمانہ حال کے موافق درست کرنے کی خدمت آپ کو ملی۔ تو مغربی لٹریچر پر غور کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔

کرنل ہالرائڈ صاحب نے لاہور میں ایک مجلسِ مشاعرہ قایم کی تھی۔ اُس میں بجائے مصرعہ طرح کے خاص خاص عنوان پر نظم لکھنا ہوتی تھی۔ اُس وقت مولانا نے قدیم طرز کو چھوڑ کر جدید طرز اختیار کیا اور اُردو شعر میں اپنے خاص طرز کے موجد ہوئے۔ **مناظرہ رحم و انصاف۔ حُبِ وطن۔ برکھا رُت۔ نشاطِ اُمید** اُس زمانہ کے کلام کی نمونہ ہیں۔ آپ کئی سال تک علی گڈھ میں بھی رہے ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ عالیہ کی طرف سے مولنا کو خطاب شمس العلما عطا ہوا۔ اِس زمانہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں اکثر نظمیں آپ نے پڑھیں جو بہت وقعت کی نظر سے دیکھی گئیں اور دور دور تک مشہور ہوئیں۔ خواجہ صاحب نے ۲۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو اِس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔

مولانا کے تالیفات میں سے نثر میں **حیاتِ سعدی۔ حیاتِ جاوید۔ مقدمۂ شعر و شاعری**۔ اُردو نظم میں **دیوانِ حالی۔ مد و جزرِ اسلام۔ شکوۂ ہند** بہت مشہور ہیں ؎

آپ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے قدیم خیالی اور مصنوعی طرز کو بدل کر نیچرل شاعری اور قومی شاعری کی تجدید کی۔ آپ کا کلام صاف۔ پاکیزہ اور قومی جذبات اور قومی اصلاح

کا پر تو لئے ہوئے ہے۔ آپ محض مصنوعی خال وخط اور خیالی حسن وجمال کے شیدائی نہیں ہیں۔ بلکہ فلسفیانہ مضامین اور تاریخی وادبی نکات آپ کے کلام میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ آپ کا مسدّس مد وجزر اسلام نہایت مقبول ہوا۔ لوگوں نے اس کے کثیر اشعار بر زبان یاد کر لئے۔ عبارت نثر میں یہ خوبی رکھی ہے کہ الفاظ مناسب میں معانی بلند کا ذخیرہ نظر آتا ہے۔ بعض مقام پر تو بالکل سرسید کی تقلید کرتے ہیں۔ کچھ لوگ مولانا حالی کو نئی شاعری کا پیغمبر خیال کرتے ہیں۔ لیکن بعض نقادانِ سخن کو اس میں کلام ہے +
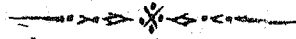
شعر کی ماہیت

(ماخوذ از مقدمۂ دیوان حالی)

شعر کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ مگر کوئی تعریف ایسی نہیں جو اُس کے تمام افراد کو جامع ہو اور مانع ہو دخولِ غیر سے۔ البتہ لارڈ مکالے نے جو کچھ شعر کی نسبت لکھا ہے گو اُس کو شعر کی تعریف نہیں کہا جا سکتا لیکن جو کچھ شعر سے آجکل مراد لی جاتی ہے اُس کے قریب قریب ذہن کو پہنچا دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "شاعری جیسا کہ دو ہزار برس پہلے کہا گیا تھا ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری بُت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہے۔ مگر مصوّر بُت تراش اور ناٹک کرنے والے کی نقل شاعر کی نسبت کسی قدر کامل تر ہوتی ہے۔ شاعر کی کَل کس چیز سے بنی ہوئی ہے؟ الفاظ کے پرزوں سے اور الفاظ ایسی چیز ہیں کہ اگر ہومر اور ڈینٹی جیسے صنّاع بھی ان کو استعمال کریں تو بھی سامعین کے متخیلہ میں اشیائے خارجی کا ایسا صحیح اور ٹھیک نقشہ نہیں اُتار سکتے جیسا موقلم اور چھینی کے کام دیکھکر ہمارے خیال میں اُترتا ہے لیکن شاعری کا میدان وسیع اس قدر ہے

کہ بُت تراشی مصوّری اور ناٹک یہ تینوں فن اُس کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے۔ بُت تراش فقط صورت کی نقل اُتار سکتا ہے۔ مصوّر صورت کے ساتھ رنگ کو بھی جھلکا دیتا ہے اور ناٹک کرنے والا بشرطیکہ شاعر نے اُس کے لئے الفاظ مہیا کر دئے ہوں صورت اور رنگ کے ساتھ حرکت بھی پیدا کر دیتا ہے مگر شاعری باوجودیکہ اشیائے خارجی کی نقل میں تینوں فنوں کا کام دے سکتی ہے اُس کو تینوں سے اس بات میں فوقیت ہے کہ انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلمرو ہے نہ وہاں مصوّری کی رسائی ہے نہ بُت تراشی کی اور نہ ناٹک کی مصوّری یا ناٹک وغیرہ انسان کے خصائل یا جذبات اِس قدر ظاہر کر سکتے ہیں جس قدر کہ چہرہ یا رنگ اور حرکت سے ظاہر ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہمیشہ ادھورے اور نظر فریب نمونے اُن کیفیات کے ہوتے ہیں جو فی الواقع انسان کے بطون میں موجود ہیں مگر نفسِ انسانی کی باریک گہری اور بوقلموں کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعہ سے ظاہر ہو سکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی اور ذہنی کا نقشہ اُتار سکتی ہے۔ عالمِ محسوسات۔ دولت کے انقلابات سیرت انسانی معاشرت نوعِ انسانی تمام چیزیں جو فی الحقیقۃ موجود ہیں اور تمام وہ چیزیں جن کا تصوّر مختلف اشیا کے اجزا کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا

ہے سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اُسی قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلمرو"۔

ایک اور محقق نے شعر کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اس لئے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اُس کو سُن کر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے خواہ نظم میں ہو اور خواہ نثر میں"۔ مذکورہ بالا تقریروں کا مطلب زیادہ دل نشین کرنے کے لئے ہم اس مقام پر چند مثالیں ذکر کرنی مناسب سمجھتے ہیں +

(۱) فردوسی کہتا ہے

بمالید چاچی کماں را بدست ۔۔۔ بچرم گوزن اندر آورد شست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست ۔۔۔ خروش از خم چرخ چاچی بخاست

ان دونوں شعروں میں رستم کی وہ حالت دکھائی ہے جبکہ وہ اشکبوس کشانی سے لڑنے کے لئے پیادہ میدانِ کارزار میں گیا ہے اور اُس پر وار کرنے کے لئے کمان میں تیر جوڑا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان شعروں کے مضمون کو اگر ایک غیر شاعر معمولی طور پر بیان کرتا تو صرف اس قدر کہنا کافی تھا کہ رستم نے کمان کے چلّے میں تیر جوڑا۔ لیکن اس بیان میں اُس حالت کی جبکہ وہ

تیر چلانے کے لئے کمان تانے کھڑا تھا نقل مطلق نہیں پائی جاتی۔ البتہ جو اسلوب فردوسی نے اس کے بیان میں اختیار کیا ہے اُس میں جہاں تک کہ الفاظ مساعدت کر سکتے ہیں اُس حالت کی کافی طور سے نقل اُتاری گئی ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک ایسی حالت ہے جو آنکھ سے محسوس ہو سکتی ہے۔ اس لئے اُس کو ایک بُت تراش یا ایک مصوّر فردوسی کے نسبت زیادہ واضح اور زیادہ نمودار صورت میں ظاہر کر سکتا ہے۔

(۲) سعدی شیرازی۔

چناں قحط سالے شد اندر دمشق ۔ کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس شعر میں دمشق کے کسی قحط کا وہ عالم بیان کیا ہے جو وہاں کے باشندوں پر طاری تھا۔ اس مضمون کو ایک غیر شاعر اس سے زیادہ بیان نہیں کر سکتا کہ خلقت بھوک پیاسی مر رہی تھی یا اناج اور پانی نایاب تھا۔ یا اور اسی قسم کی معمولی باتیں جو قحط کے زمانے میں عموماً پیش آتی ہیں۔ لیکن منتہائے سختی قحط کی تصویر جن لفظوں میں کہ سعدی نے کھینچی ایسے معمولی بیانات سے ہرگز نہیں کھنچ سکتی اور چونکہ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو محسوس نہیں ہو سکتی اِس لئے شاعر کے سوا مصوّر اور بُت تراش دونوں

اُس کی نقل اُتارنے سے عاجز ہیں البتہ ایکٹر ایسا تماشہ دکھانے سے کسی قدر عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ شاعر نے اُس کے لئے کافی الفاظ مہیّا کر دئے ہوں ؂

(۴) ابن دراج اندلسی ایک قصیدہ میں اپنے شیر خوار بچّہ کی وہ حالت جبکہ وہ خود گھر والوں سے رخصت ہو کر کہیں دور جانے والا ہے اور بچّہ اُس کے مُنھ کو تک رہا ہے۔ بیان کرتا ہے

عَیِیٌّ بِمَرْجُوْعِ الْخِطَابِ وَلَحْظُهٗ بِمَوْقِعِ اَهْوَاءِ النُّفُوْسِ خَبِیْرُ

یعنی وہ بات کا جواب دینے سے تو عاجز ہے مگر اُس کی آنکھ اُن اداؤں سے واقف ہے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اس شعر میں اُستاد نے ایک محض وجدانی کیفیت کی تصویر کھینچی ہے۔ جس کی محاکات زمانہ حال کے مصوّر۔ بُت تراش اور ایکٹر بھی بلاشبہ کسی قدر کر سکتے ہیں۔ لیکن نہ ایسی جیسی کہ شاعر نے کی ہے۔ نیز شاعر کے سوا کسی کو یہ اسلوب بیان ہرگز نہیں سوجھ سکتا۔ کیونکہ جس مطلب کو اُس نے اِس پیرائے میں بیان کیا ہے اُس کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ رخصت ہوتے وقت جو وہ میری طرف دیکھتا تھا اُس پر بے اختیار پیار آتا تھا۔ اِس معمولی بات کو وہ اِس طرح ادا کرتا ہے کہ وہ شیر خوار بچّہ جس کے مُنھ میں بول تک نہ تھا اُس کی آنکھ ایک ایسے بھید سے

واقف تھی جس سے اکثر بڑے بڑے عاقل اور دانشمند واقف نہیں ہوتے یعنی یہ کہ کس طرح اوروں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

نظیری نیشاپوری۔

بہ زیرِ شاخِ گُل افعی گزیدہ بلبل را — نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

فصلِ بہار میں پھولوں کے کھلنے یا ہوا میں اعتدال پیدا ہونے یا بدن میں دورانِ خون کے تیز ہو جانے سے جو نشاط اور اُمنگ بلبل کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور جس کو شعرا گل و گلشن کے عشق سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کے جوش اور ولولہ میں وہ دن بھر چہکتا رہتا ہے اُس حالت اور کیفیت کو شاعر نے افعی کے کاٹے کی لہر سے تعبیر کیا ہے۔ گو یہ تمثیل بھی اُس حالت کی اصل حقیقت ظاہر کرنے سے قاصر ہو۔

مگر جس قدر کہ اُس حالت کا تصوّر ان لفظوں کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے اُتنا بھی تصویر یا ناٹک کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ گویا اِس کیفیت کا ظاہر کرنا مصوّری بُت تراشی اور ناٹک کی دسترس سے باہر ہے۔

شاعری کے لئے کیا کیا شرطیں ضرور ہیں۔

اُمید ہے کہ اِن مثالوں سے شاعر اور غیر شاعر کے کلام میں اور نیز شعر اور مصوّری میں جو فرق ہے وہ بخوبی ظاہر ہو گیا ہوگا*

اب ہم کو یہ بتانا ہے کہ شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے کون سی شرطیں ضروری ہیں اور شاعر میں وہ کون سی خاصیت ہے جو اُس کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے۔

تخیّل

سب سے مقدّم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے۔ قوتِ متخیلہ یا تخیّل ہے۔ جس کو انگریزی میں امیجنیشن کہتے ہیں۔ یہ قوت جس قدر شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہو گی اُسی قدر اُس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہو گی اور جس قدر یہ ادنیٰ درجہ کی ہو گی اُسی قدر اُس کی شاعری ادنیٰ درجہ کی ہو گی۔ یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لیکر نکلتا ہے۔ اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے۔ اور باقی شرطوں میں جو کہ کمال شاعری کے لئے ضروری ہیں کچھ کمی ہے تو وہ اُس کمی کا تدارک اِس ملکہ سے کر سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ ملکہ فطری کسی میں موجود نہیں ہے تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اُس کے قبضہ میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد کرتی ہے اور ماضی و استقبال کو اُس کے لئے زمانۂ حال میں کھینچ لاتی ہے۔ وہ آدم اور جنّت کی سرگذشت اور حشر و نشر کا بیان اِس طرح

کرتا ہے کہ گویا اُس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ اور ہر شخص
اُس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہیے۔
اُس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ جن اور پری عنقا اور آبِ حیوان
جیسی فرضی اور معدوم چیزوں کو ایسے معقول اوصاف کے ساتھ
متّصِف کرسکتا ہے کہ اُن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔
جو نتیجے وہ نکالتا ہے گو وہ منطق کے قاعدوں پر منطبق نہیں ہوتے لیکن
جب دل اپنی معمولی حالت سے کسی قدر بلند ہو جاتا ہے تو وہ بالکل
ٹھیک معلوم ہوتے ہیں مثلاً فیضی کہتا ہے۔

سخت است سیاہیِ شبِ من   لختے زِ شب ست کوکبِ من

اِس پر منطقی قاعدہ سے یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ رات کی تاریکی
سب کے لئے یکساں ہوتی ہے پھر ایک خاص شخص کی رات سب سے
زیادہ تاریک کیونکر ہو سکتی ہے اور تمام کواکب ایسے اجرام ہیں جن کا
وجود بغیر روشنی کے تصوّر میں نہیں آسکتا۔ پھر ایک خاص کوکب ایسا
مظلم اور سیاہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اُس کو کالی رات کا ایک ٹکڑا کہا جا سکے
مگر جس عالم میں شاعر اپنے تئیں دکھانا چاہتا ہے وہاں یہ سب ناممکن
باتیں ممکن بلکہ موجود نظر آتی ہیں۔ یہی وہ ملکہ ہے جس سے بعض اوقات
شاعر کا ایک لفظ جادو کی فوج سامنے کھڑی کر دیتا ہے اور کبھی وہ

ایک ایسے خیال کو جو کئی جلدوں میں بیان ہو سکے ایک لفظ میں ادا کر سکتا ہے ؛

تخیل یا امیجنیشن کی تعریف کرنی بھی ایسی ہی مشکل ہے جیسی کہ شعر کی تعریف مگر بن وجہِ اس کی ماہیت کا خیال ان لفظوں سے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے یہ اُس کو مکرّر ترتیب دیکر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اسکو الفاظ کے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔ اِس تقریر سے ظاہر ہے کہ تخیل کا عمل اور تصرّف جس طرح خیالات میں ہوتا ہے اُسی طرح الفاظ میں بھی ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات شاعر کا طریقۂ بیان ایسا نرالا اور عجیب ہوتا ہے کہ غیر شاعر کا ذہن کبھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہی ایک چیز ہے جو کبھی تصوّرات اور خیالات میں تصرّف کرتی ہے اور کبھی الفاظ وعبارات میں۔ اگرچہ اِس قوّت کا ہر ایک شاعر کی ذات میں موجود ہونا نہایت ضروری ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کا عمل شاعر کے ہر ایک کلام میں یکساں نہیں ہوتا بلکہ کہیں زیادہ ہوتا ہے کہیں کم

ہوتا ہے اور کہیں محض خیالات میں ہوتا ہے کہیں محض الفاظ میں۔
یہاں چند مثالیں بیان کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں +

(۱) غالب دہلوی۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا   جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار
موجود تھیں کہ مٹّی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے جو
بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے۔ اور جام جمشید ایک ایسی چیز تھی کہ
جس کا بدل دنیا میں موجود نہ تھا اُس کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم
کے نزدیک جام سفال میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس کی وجہ سے
وہ جام جم جیسی چیز سے فایق اور افضل سمجھا جائے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا
کہ جام جم میں شراب پی جاتی تھی اور مٹّی کے کوزہ میں بھی شراب
پی جا سکتی ہے۔ اب قوّتِ متخیلّہ نے ان تمام معلومات کو ایک نئے
ڈھنگ سے ترتیب دیکر ایسی صورت میں جلوہ گر کر دیا کہ جام سفال
کے آگے جام جم کی کچھ حقیقت نہ رہی۔ اور پھر اُس صورتِ موجودہ
فی الذّہن کو بیان کا ایک دلفریب پیرایہ دیکر اس قابل کر دیا کہ زبان
اُس کو پڑھکر متلذذ اور کان اُس کو سُن کر محظوظ اور دل اس کو
سمجھکر متاثّر ہو سکے۔ اس مثال میں وہ قوّت جس نے شاعر کی معلومات

سابقہ کو دوبارہ ترتیب دیکر ایک نئی صورت بخشی ہے وہ تخیل یا امیجنیشن ہے اور اس نئی صورتِ موجودہ فی الذہن نے جب الفاظ کا لباس پہن کر عالم محسوسات میں قدم رکھا ہے اس کا نام شعر ہے نیز اس مثال میں امیجنیشن کا عمل خیالات اور الفاظ دونوں کے لحاظ سے بمرتبہ غایت اعلیٰ درجہ میں واقع ہوا ہے کہ باوجود کمال سادگی اور بے ساختگی کے نہایت بلند اور نہایت تعجب انگیز ہے ؛

(۲) غالب کا اسی زمین میں دوسرا شعر یہ ہے۔

اُن کے آنے سے جو آجاتی ہے رونق منہ پر ؛ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شاعر کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ دوست کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور بگڑی ہوئی طبیعت بحال ہو جاتی ہے نیز یہ بھی معلوم تھا کہ دوست کو جب تک عاشق اپنی حالت زار اور اُس کی جدائی کا صدمہ نہ جتائے دوست عاشق کی محبت اور عشق کا پورا پورا یقین نہیں کر سکتا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ بعض خوشی سے دفعتہً ایسی بشاشت ہو سکتی ہے کہ رنج و غم اور تکلیف کا مطلق اثر چہرہ پر باقی نہ رہے۔ اب امیجنیشن نے ان تمام معلومات میں اپنا تصرف کر کے ایک نئی ترتیب پیدا کر دی یعنی یہ کہ عاشق کسی طرح اپنی جدائی کے زمانہ کی تکلیفیں معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ جب تکلیف کا وقت ہوتا ہے

اُس وقت معشوق نہیں ہوتا اور جب معشوق ہوتا ہے اُس وقت تکلیف نہیں رہتی اِس مثال میں بھی امیجینیشن کا عمل معناً اور لفظاً دونوں طرح بدرجۂ غایت لطیف اور حیرت انگیز واقع ہوا ہے جیسا کہ ہر صاحبِ ذوقِ سلیم پر ظاہر ہے ٭

(۳) خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

صبا بہ لطف بگو آں غزالِ رعنا را   کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادہ ٔ ما را

اِس شعر کا خلاصہ مطلب اِس سے زیادہ نہیں ہے کہ ہم صرف معشوق کی بدولت پہاڑوں اور جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اِس میں امیجینیشن کا عمل خیالات میں اگر ہو بھی تو نہایت خفیف اور مختصر ہوگا مگر الفاظ میں اُس نے وہ کرشمہ دکھایا ہے جس نے شعر کو بلاغت کے اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا ہے۔ اسی قسم کے کلام کی نسبت کہا گیا ہے ؎ عبارتے کہ بمعنی برابری دارد۔ اوّل تو صبا کی طرف خطاب کرنا جس میں یہ اشارہ ہے کہ کوئی ذریعہ دوست تک پیغام پہنچانے کا نظر نہیں آتا۔ ناچار صبا کو یہ سمجھکر پیغامبر بنایا ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے۔ شاید دوست تک بھی اُس کا گذر ہو جائے۔ گویا شوق نے ایسا ازخود رفتہ کر دیا ہے کہ جو چیز پیغامبر ہونے کی قابلیت نہیں رکھتی اُسی کے ہاتھ

پیغام بھیجتا ہے اور جواب کا امیدوار ہے۔ پھر معشوقِ حقیقی کو جس کی ذات بے نشان ہے بطور استعارہ کے غزالِ رعنا کے ساتھ تعبیر کرنا جس سے بہتر استعارہ نہیں ہو سکتا اور پھر اُس کی طلب کو غزالِ رعنا کی مناسبت سے کوہ و بیابان میں پھرنے سے تعبیر کرنا اور پھر باوجود ضمیر متصل کے جو کہ دادہٴ میں موجود تھی ضمیر مخاطب منفصل یعنی لفظ تو اضافہ کرنا جس سے پایا جائے کہ تیرے سوا کوئی شے ہماری اس سرگشتگی کا باعث نہیں ہے۔ اور چونکہ پیغام شکایت آمیز تھا اس لئے صبا سے یہ درخواست کرنی کہ بہ لطف بگو یعنی نرمی اور ادب سے یہ پیغام دینا تاکہ شکایت ناگوار نہ گزرے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جنہوں نے ایک معمولی بات کو اِس قدر بلند کر دیا ہے کہ اعلیٰ درجے کے باریک خیالات بھی اُس سے زیادہ بلندی پر نہیں دکھائے جا سکتے۔

دوسری شرط کائنات کا مطالعہ اگرچہ قوتِ متخیلہ اُس حالت میں بھی جبکہ شاعر کی معلومات کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہو اُسی معمولی ذخیرہ سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے۔ لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ نسخۂ کائنات اور اُس میں سے خاصکر نسخۂ فطرتِ انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اُس کو پیش آتی ہیں

اُن کو تعمق کی نگاہ سے دیکھنا جو امور مشاہدہ میں آئیں اُن کے ترتیب دینے کی عادت ڈالنی کائنات میں گہری نظر سے وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرنے جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں اور فکر میں مشق و مہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے متحد اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کر سکے اور اِس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانے میں محفوظ رکھے۔

مختلف چیزوں سے متحد خاصیت اخذ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے مرزا غالب کہتے ہیں۔

بوئے گل نالۂ دل دُودِ چراغِ محفل جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

(دوسری مثال)

بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا ناہید بغمزہ کشت و مریخ بقہر

ناہید یعنی زہرہ کو سعد اور مریخ کو نحس مانا گیا ہے پس دونوں باعتبارِ ذات اور صفات کے مختلف ہیں مگر شاعر کہتا ہے کہ اُن کے سعادت و نحوست کے اختلاف کو رہنے دو مجھ پر تو اُن کا اثر یکساں ہی ہوتا ہے۔ مریخ قہر سے قتل کرتا ہے تو زہرہ غمزہ سے۔

اور متحد اشیا سے مختلف خاصیتیں استنباط کرنے کی مثال میر ممنون کا یہ شعر ہے۔

تفاوت قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا مومن
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

یعنی قامتِ معشوق اور قیامت فتنہ ہوتے ہیں تو دونوں متحد ہیں
مگر فرق یہ ہے کہ فتنۂ قیامت سانچے میں ڈھلا ہوا نہیں ہے اور
قامتِ معشوق سانچے میں ڈھلا ہوا ہے +

غرضکہ یہ تمام باتیں جو اوپر ذکر کی گئی ہیں ایسی ضروری ہیں کہ کوئی
شاعر اُن سے استغنا کا دعویٰ نہیں کرسکتا کیونکہ ان کے بغیر قوتِ متخیلہ
کو اپنی اصلی غذا جس سے وہ نشوونما پاتی ہے نہیں پہنچتی بلکہ اُس کی طاقت
آدھی سے بھی کم رہجاتی ہے +

قوتِ متخیلہ کوئی شے بغیر مادہ کے پیدا نہیں کرسکتی بلکہ جو مصالح اُس کو
خارج سے ملتا ہے اُس میں وہ اپنا تصرف کرکے ایک نئی شکل تراش
لیتی ہے جتنے بڑے بڑے نامور شاعر دنیا میں گذرے ہیں وہ کائنات
یا فطرتِ انسانی کے مطالعہ میں ضرور مستغرق رہے ہیں جب رفتہ
رفتہ اُس مطالعہ کی عادت ہوجاتی ہے تو ہر ایک چیز کو غور سے دیکھنے
کا ملکہ ہوجاتا ہے اور مشاہدوں کے خزانے گنجینۂ خیال میں خود بخود
جمع ہونے لگتے ہیں +

سر والٹر اسکاٹ کی شاعری

سر والٹر اسکاٹ جو انگلستان کا ایک مشہور شاعر ہے اُس کی نسبت لکھا ہے کہ اُس کی خاص خاص نظموں میں دو خاصیتیں ایسی ہیں جن کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ ایک اصلیت سے تجاوز نہ کرنا۔ دوسرے ایک ایک مطلب کو نئے نئے اسلوب سے ادا کرنا۔ جہاں کہیں اُس نے کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا کا بیان کیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس موقع کی روح میں جو خاصیتیں تھیں سر والٹر نے وہ سب انتخاب کر لی تھیں سر والٹر کی نظم پڑھکر آنکھوں کے سامنے بالکل وہی سماں بندھ جاتا ہے جو پہلے خود اُس موقع کے دیکھنے سے معلوم ہوا تھا اور اب دھیان سے اُتر گیا تھا۔ ظاہراً اُس نے اِن بیانات میں قوتِ متخیّلہ پر ایسا بھروسہ نہیں کیا کہ اصلیت کو چھوڑ کر محض تخیّل ہی پر قناعت کر لیتا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ روکبی کا قصّہ لکھ رہا تھا ایک شخص نے اُس کو دیکھا کہ پاکٹ بُک میں چھوٹے چھوٹے خود رَو پھول پتّے اور میوے جو وہاں اُگ رہے تھے اُن کو نوٹ کر رہا ہے۔ ایک دوست نے اُس سے کہا کہ اِس دردِسر سے کیا فائدہ؟ کیا عام پھول کافی نہ تھے جو چھوٹے چھوٹے پھولوں کو ملاحظہ کرنے کی ضرورت پڑی۔ سر والٹر نے کہا "تمام کائنات میں دو چیزیں بھی ایسی نہیں جو بالکل یکساں ہوں"

پس جو شخص محض اپنے تخیل پر بھروسہ کر کے مذکورۂ بالا مطالعہ سے
چشم پوشی یا غفلت کرے گا اُس کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ
اُس کے دماغ میں چند معمولی تشبیہوں یا تمثیلوں کا ایک نہایت
محدود ذخیرہ ہے جن کو برتتے برتتے خود اُس کا جی اُکتا جائے گا
اور سامعین کو سُنتے سُنتے نفرت ہو جائے گی۔ جو شخص شعر کی ترتیب
میں اصلیت کو ہاتھ سے نہیں دیتا اور محض ہوا پر اپنی عمارت کی
بنیاد نہیں رکھتا وہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایک مطلب کو
جتنے اسلوبوں میں چاہے بیان کرے۔ اُس کا تخیل اُسی قدر
وسیع ہوگا جس قدر کہ اُس کا مطالعہ وسیع ہے۔

تیسری شرط تفحص الفاظ

کائنات کے مطالعہ کی عادت ڈالنے کے بعد دوسرا
نہایت ضروری مطالعہ یا تفحص اُن الفاظ کا ہے جن کے
ذریعہ سے مخاطب کو اپنے خیالات مخاطب کے روبرو پیش کرتے
ہیں یہ دوسرا مطالعہ بھی ویسا ہی ضروری اور اہم ہے جیسا کہ پہلا۔
شعر کی ترتیب کے وقت اوّل متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور
پھر اُن کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنی مقصود کے سمجھنے
میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے۔ اور خیال کی تصویر ہو بہو آنکھوں
کے سامنے پھر جائے اور باوجود اس کے اس ترتیب میں ایک جادو

مخفی ہو جو مخاطب کو مسخر کرے۔ اِس مرحلہ کا طے کرنا جس قدر دشوار ہے
اُسی قدر ضروری بھی ہے کیونکہ اگر شعر میں یہ بات نہیں ہے تو اُس کے
کہنے سے نہ کہنا بہتر ہے۔ اگرچہ شاعر کے متخیّلہ کو الفاظ کی ترتیب میں
بھی ویسا ہی دخل ہے جیسا کہ خیالات کی ترتیب میں لیکن اگر شاعر
زبان کے ضروری حصّہ پر حاوی نہیں ہے اور ترتیبِ شعر کے وقت
صبر و استقلال کے ساتھ الفاظ کا تتبّع اور تفحص نہیں کرتا تو محض قوتِ
متخیّلہ کچھ کام نہیں آسکتی +

جن لوگوں کو یہ قدرت ہوتی ہے کہ شعر کے ذریعہ سے اپنے
ہم جنسوں کے دل میں اثر پیدا کر سکتے ہیں اُن کو ایک ایک لفظ کی
قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں لفظ جمہور
کے جذبات پر کیا اثر رکھتا ہے اور اُس کے اختیار کرنے یا ترک کرنے
سے کیا خاصیت بیان میں پیدا ہوتی ہے۔ نظم الفاظ میں اگر بال برابر
بھی کمی رہجاتی ہے تو وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ ہمارے شعر میں کون سی
بات کی کسر ہے جس طرح ناقص سانچے میں ڈھلی ہوئی چیز فوراً
چغلی کھاتی ہے اسی طرح اُن کے شعر میں اگر تاؤ بھاؤ بھی فرق
رہجاتا ہے معاً اُن کی نظر میں کھٹک جاتا ہے اگرچہ وزن اور قافیہ
کی قید ناقص اور کامل دونوں قسم کے شاعروں کو اکثر اوقات ایسے

لفظ کے استعمال پر مجبور کرتی ہے جو خیال کو بخوبی ادا کرنے سے قاصر ہے مگر فرق صرف اس قدر ہے کہ ناقص شاعر تھوڑی سی جستجو کے بعد اُسی لفظ پر قناعت کر لیتا ہے اور کامل جب تک زبان کے تمام کنوئیں نہیں جھانک لیتا تب تک اس لفظ پر قانع نہیں ہوتا شاعر کو جب تک الفاظ پر کامل حکومت اور اُن کی تلاش و جستجو میں نہایت صبر و استقلال حاصل نہو ممکن نہیں کہ وہ جمہور کے دلوں پر بالاستقلال حکومت کر سکے۔ ایک حکیم شاعر کا قول ہے کہ "شعر شاعر کے دماغ سے ہتھیار بند نہیں کودتا بلکہ خیال کی ابتدائی ناہمواری سے لیکر انتہائی تنقیح و تہذیب تک بہت سے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں جو کہ اب سامعین کو شاید محسوس نہ ہوں لیکن شاعر کو ضرور پیش آتے ہیں"

اِس بحث کے متعلق چند اُمور ہیں جن کو فکرِ شعر کے وقت ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اوّل خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا لباس پہنانا پھر اُن کو جانچنا اور تولنا۔ اور ادائے معنی کے لحاظ سے اُن میں جو قصور رہجائے اُس کو رفع کرنا۔ الفاظ کو ایسی ترتیب سے منتظم کرنا کہ صورۃً اگرچہ نثر سے متمیز ہو مگر معنی اُسی قدر پورے ادا کرے جیسے کہ نثر میں ادا ہو سکتے۔ شاعر بشرطیکہ شاعر ہو اوّل تو وہ ان باتوں کا لحاظ وقت پر ضرور کرتا ہے اور اگر کسی وجہ سے بالفعل اُس کو زیادہ

غور کرنے کا موقع نہیں ملتا تو پھر جب کبھی وہ اپنے کلام کو اطمینان کے وقت دیکھتا ہے اُس کو ضرور کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شاعروں کا کلام مختلف نسخوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

آمد و آورد میں فرق

اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ جو شعر شاعر کی زبان یا قلم سے فوراً بے ساختہ ٹپک پڑتا ہے وہ اُس شعر سے زیادہ لطیف اور بامزہ ہوتا ہے۔ جو بہت دیر میں غور و فکر کے بعد مرتّب کیا گیا ہو۔

پہلی صورت کا نام انھوں نے آمد رکھا ہے اور دوسری کا آورد۔ بعضے اِس موقع پر یہ مثال دیتے ہیں کہ جو شیرہ انگور سے خود بخود ٹپکتا ہے وہ اُس شیرہ سے زیادہ لطیف و بامزہ ہوتا ہے جو انگور سے نچوڑ کر نکالا جائے۔ مگر ہم اِس رائے کو تسلیم نہیں کرتے۔ اوّل تو یہ مثال جو اِس موقع پر دیجاتی ہے اسی سے اُس رائے کے خلاف ثابت ہوتا ہے جو شیرہ انگور سے خود بخود اُس کے پک جانے کے بعد ٹپکتا ہے وہ یقیناً اُس شیرہ کی نسبت بہت دیر میں طیار ہوتا ہے جو کچے یا ادھ کچرے انگور سے نچوڑ کر نکالا جاتا ہے مستثنیٰ حالتوں کے سوا ہمیشہ وہی شعر زیادہ مقبول۔ زیادہ لطیف زیادہ بامزہ۔ زیادہ سنجیدہ اور زیادہ موثر ہوتا ہے جو کمال غور و فکر

کے بعد مرتب کیا گیا ہو۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر کسی موقع پہ پاکیزہ خیالات جو اُس کے حافظہ میں پہلے سے ترتیب وار محفوظ ہوں مناسب الفاظ میں جو حُسنِ اتفاق سے فی الفور اُس کے ذہن میں آجائیں ادا کر دے۔ لیکن اوّل تو ایسے اتفاقات شاذ و نادر ظہور میں آتے ہیں والنادر کالمعدوم۔ دوسرے اُن خیالات کو جو مدت سے انگور کے شیرہ کی طرح اُس کے ذہن میں پک رہے تھے کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ جھٹ پٹ بغیر غور و فکر کے سرانجام ہو گئے ہیں شعر میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک خیال دوسرے الفاظ۔ خیال تو ممکن ہے کہ شاعر کے ذہن میں فوراً ترتیب پا جائے مگر اُس کے لئے الفاظ مناسب کا لباس تیار کرنے میں ضرور دیر لگے گی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک مستری مکان کا نہایت عمدہ اور نرالا نقشہ ذہن میں فوراً تجویز کرلے مگر یہ ممکن نہیں کہ اُس نقشہ پر مکان بھی ایک چشم زدن میں تیار ہو جائے۔ وزن اور قافیہ کی اوگھٹ گھاٹی سے صحیح سلامت نکل جانا اور مناسب الفاظ کے تفحص سے عہدہ برآ ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے اگر ایک دن کا کام ایک گھنٹے میں کیا جائے گا تو وہ کام نہ ہوگا بلکہ بیگار ہوگی+

روما کے مشہور شاعر ورجل کے حال میں لکھا ہے کہ صبح کو

اپنے اشعار لکھواتا تھا اور دن بھر اُن پر غور کرتا تھا اور اُن کو چھانٹتا تھا اور یہ کہا کرتا تھا کہ ریچھنی بھی اسی طرح اپنے بدصورت بچّوں کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بناتی ہے۔ ایریسٹو شاعر جس کے کلام میں مشہور ہے کہ کمال بے ساختگی اور آمد معلوم ہوتی ہے اُس کے مسودے اب تک فریرا علاقہ اٹلی میں محفوظ ہیں اُن مسودوں کے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جو اشعار اُس کے نہایت صاف اور سادے معلوم ہوتے ہیں وہ آٹھ آٹھ دفعہ کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ملٹن بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ نہایت سخت محنت اور جانفشانی سے نظم لکھی جاتی ہے اور نظم کی ایک ایک بیت میں اُس کے سڈول ہونے سے پہلے کتنی ہی تبدیلیاں پے درپے کرنی پڑتی ہیں ایک فارسی گو شاعر بھی فکر شعر کی حالت اِس طرح بیان کرتا ہے:۔

برائے پاکئ لفظے شبے بروز آرد ۔۔۔ کہ مرغ و ماہی باشند خفتہ او بیدار

سچ یہ ہے کہ کوئی نظم جس نے استقلال کے ساتھ جمہور کے دل پر اثر کیا ہو خواہ طویل ہو خواہ مختصر۔ ایسی نہیں ہے جو بے تکلّف لکھ کر پھینک دی گئی ہو جس قدر کسی نظم میں زیادہ بیساختگی اور آمد معلوم ہوتی ہے اُسی قدر جاننا چاہیئے کہ اُس پر زیادہ محنت زیادہ غور

اور زیادہ حک و اصلاح کی گئی ہوگی۔

ابن رشیق اپنی کتاب عمدہ میں لکھتے ہیں کہ جب شعر سرانجام ہو جائے تو اُس پر بار بار نظر ڈالنی چاہئے اور جہاں تک ہوسکے اُس میں خوب تنقیح و تہذیب کرنی چاہئے پھر بھی اگر شعر میں جودت اور خوبی پیدا نہ ہو تو اُس کے دور کرنے میں پس و پیش نہ کرنا چاہئے جیسا کہ اکثر شعرا کیا کرتے ہیں۔ انسان اپنے کلام پر اس لئے کہ وہ اُس کی مجازی اولاد ہوتی ہے مفتوں اور فریفتہ ہوتا ہے پس اگر اُس کے دور کرنے میں مضائقہ کیا جائے گا تو ایک بُرے شعر کے سبب سارا کلام درجۂ بلاغت سے گر جائے گا۔

انشاپردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے نہ معانی پر

ابن خلدون اسی الفاظ کی بحث کے متعلق لکھتے ہیں کہ "انشاپردازی کا ہنر نظم میں ہو یا نثر میں محض الفاظ میں ہے معانی میں ہرگز نہیں۔ معانی صرف الفاظ کے تابع ہیں اور اصل الفاظ ہیں۔ معانی ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں پس اُن کے لئے کسی ہنر کے اکتساب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ضرورت ہے تو صرف اِس بات کی ہے کہ اُن معانی کو کس طرح الفاظ میں ادا کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ الفاظ کو ایسا سمجھو جیسے پیالہ اور معانی کو ایسا سمجھو جیسے پانی۔ پانی کو چاہو سونے کے پیالے میں بھر لو اور چاہو چاندی کے پیالے

میں اور چاہو کانچ یا بلور یا سیپ کے پیالے میں - اور چاہو مٹّی کے پیالے
میں - پانی کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا مگر سونے یا چاندی وغیرہ کے
پیالے میں اُس کی قدر بڑھ جاتی ہے، اور مٹّی کے پیالے میں کم ہو جاتی
ہے اسی طرح معانی کی قدر ایک فصیح اور ماہر کے بیان میں زیادہ ہو جاتی
ہے اور غیر فصیح کے بیان میں گھٹ جاتی ہے۔" مگر ہم اُن کی جناب میں
عرض کرتے ہیں کہ حضرت اگر پانی کھاری یا گدلا یا بوجھل یا ادھن ہو گا یا
ایسی حالت میں پلایا جائے گا جبکہ اُس کی پیاس مطلق نہ ہو تو خواہ سونے
یا چاندی کے پیالے میں پلایئے خواہ بلور اور پھٹک کے پیالے میں وہ
ہرگز خوشگوار نہیں ہو سکتا اور ہرگز اُس کی قدر نہیں بڑھ سکتی ہم یہ بات
تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے اُس قدر معانی
پر نہیں معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کئے
جائیں گے ہرگز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے اور ایک مبتذل مضمون
پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابل تحسین ہو سکتا ہے لیکن معانی سے
یہ سمجھ کر کہ وہ ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں اور اُن کے لئے کسی ہنر
کے اکتساب کی ضرورت نہیں - بالکل قطع نظر کرنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا
اگر شاعر کے ذہن میں صرف وہی چند محدود خیالات جمع ہیں جن کو اگلے
شعرا باندھ گئے ہیں یا صرف وہی معمولی باتیں اُس کو بھی معلوم ہیں جیسی

کہ عام لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں اور اُس نے شاعری کی تکمیل کے لئے اپنی معلومات کو وسعت نہیں دی اور صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کی عادت نہیں ڈالی اور قوتِ متخیلّہ کے لئے زیادہ مصالح جمع نہیں کیا گو زبان پر اُس کو کیسی ہی قدرت اور الفاظ پر کیسا ہی قبضہ حاصل ہو اُس کو دو مشکلوں میں سے ایک مشکل ضرور پیش آئے گی یا تو اُس کو وہی خیالات جو اگلے شعرا باندھ چکے ہیں تھوڑے تھوڑے تغیّر کے ساتھ اُنہیں کے اسلوب پر بار بار باندھنے پڑیں گے یا ایک ایک مبتذل اور پامال مضمون کے لئے نئے نئے اسلوبِ بیان ڈھونڈھنے پڑیں گے جن کا مقبول ہونا نہایت مشتبہ ہے اور نامقبول ہونا قرین قیاس ہے

شعر میں کس قسم کی باتیں بیان کرنی چاہئیں۔

اِس کے سوا معنی کے متعلق ایک اور کمال حاصل کرنے کی ضرورت ہے جس کو الفاظ سے کچھ تعلق نہیں صرف نیچر کا مطالعہ اور معلومات کا ذخیرہ جمع کر لینا ہی شاعر کا کام نہیں ہے بلکہ ہر ایک شے کی روح میں جو خاصیتیں ہیں اُن کا انتخاب کرنا اور اُن کی تصویر کھینچنا شاعر کا کام ہے شاعر مثلاً نباتات اور پھل اور پھول کو اُس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے ایک محقق علمِ نباتات کا دیکھتا ہے یا وہ ایک واقعہ تاریخی پر اُس حیثیت سے نظر نہیں ڈالتا جس حیثیت سے کہ ایک مورّخ نظر ڈالتا ہے وہ ہر ایک شے میں سے

صرف وہ خاصیتیں چُن لیتا ہے جن پر قوّتِ متخیلہ کا عمل چل سکے اور عام نظروں سے مخفی ہوں جس طرح ایک نیاریا ریت میں سے چاندی کے ذرّے نکال لیتا ہے جو کسی کو نہیں سوجھتے۔ اسی طرح شاعر ہر ایک چیز اور ہر ایک واقعہ میں سے صرف ذوقیات لے لیتا ہے جن میں اُس کے سوا کسی کا حصّہ نہیں اور باقی کو چھوڑ دیتا ہے مثلاً سکندر کے مرنے کا حال اور اُس کے اخیر وقت کے واقعات مؤرخین نے جو کچھ لکھے ہوں سو لکھے ہوں مگر ایک مورلسٹ شاعر اُن سے صرف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ:۔

سکندر کہ بر عالمے حکم داشت ۔۔۔ دراں دم کہ بگذشت و عالم گذاشت
میسّر نبودش کزو عالمے ۔۔۔ ستانند مہلت و ہندش دمے

یا فصل بہار میں بلبل ہزار داستان کے غیر معمولی چہچہے دیکھ کر ایک خواص حیوانات کا محقق اُس کے جو کچھ اسباب قرار دے سو دے مگر ایک متصوّف شاعر اُس کے یہ معنی بتاتا ہے۔

بلبلے برگِ گلِ خوشرنگ در منقار داشت ۔۔۔ وندراں برگ و نوا خوش نالہ ہائے زار داشت
گفتمش در عینِ وصل ایں نالہ و فریاد چیست ۔۔۔ گفت مارا جلوہ معشوق برایں کار داشت

پس یہ کہنا کہ شاعری کا کمال محض الفاظ میں ہے معانی میں ہرگز نہیں کسی طرح ٹھیک نہیں سمجھا جا سکتا۔

اعلیٰ طبقہ کے شعرا کا کلام یاد ہونا چاہئے۔

ابن رشیق کہتے ہیں کہ شاعر کو اعلیٰ طبقہ کے شعرا کا کلام یاد ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنے شعر کی بنیاد اسی منوال پر رکھے جو شخص اساتذہ کے کلام سے خالی الذہن ہوگا اگر وہ محض طبیعت کی اپج سے کچھ لکھ بھی لے گا تو اُس کو شعر نہیں بلکہ نظم ساقط از اعتبار یا ٹکسال باہر کہیں گے۔ پس جب اُس کا حافظہ بلغا کے کلام سے پُر ہوجائے اور اُن کی روش ذہن کی لوح پر نقش ہوجائے تب فکرِ شعر کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اب جس قدر مشق زیادہ ہوگی اُسی قدر ملکۂ شاعری مستحکم ہوگا۔

ابن رشیق نے یہ ہدایت خاص عربی زبان کے نسبت کی ہے۔ شاید عربی زبان کے لئے یہ ہدایت مناسب ہو کیونکہ وہاں ایک مدتِ دراز سے شاعری کا دور دورہ چلا آتا تھا ہزار برس سے زیادہ گذر چکے تھے کہ ہر عہد اور طبقہ میں ایک سے ایک بہتر و برتر شاعر نظر آتا تھا۔ زبان میں بے انتہا وسعت پیدا ہوگئی تھی ہر مطلب کے ادا کرنے کے لئے صدہا اسلوب اور پیرایے لٹریچر میں موجود تھے۔ شاید وہاں یہ بات ممکن ہو کہ ہر مطلب کے ادا کرنے کے لئے قدما کا اسلوب اختیار کیا جائے اور نئے اسلوب پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ لیکن ایک ایسی ناکمل زبان جیسی کہ اردو ہے جس کی شاعری ابھی تک محض طفولیت کی حالت میں ہے جس کے لٹریچر کی عمر اگر انصاف سے دیکھا جائے تو پچاس ساٹھ برس سے زیادہ

نہیں جس کا لغت آج تک مدوّن نہیں ہوا جس کی گرامر آج تک اطمینان کے قابل نہیں بنی جس کے لایق مصنّف اور شاعر انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں ایسی زبان میں اگر اساتذہ کے تتبّع ہی پر تکیہ کرلیا جائے تو جس طرح ابابیل کا گھوسلہ ابتدائے آفرینش سے ایک ہی حالت پر چلا آتا ہے اور اُسی حالت پر چلا جائے گا۔ اِسی طرح اُردو شاعری جس گہوارہ میں اُس نے آنکھیں کھولی ہیں اُسی گہوارہ میں ہمیشہ جھولتی رہے گی+

اِس کے بعد ابنِ رشیق کہتے ہیں کہ "بعضوں کی رائے یہ ہے کہ ایک بار اساتذہ کے کلام پر تفصیلی نظر ڈال کر اُس کو صفحۂ خاطر سے محو کر دینا چاہیے۔ کیونکہ اُس کا بعینہٖ ذہن میں محفوظ رہنا ویسی ترکیبوں اور اسلوبوں کے استعمال کرنے سے ہمیشہ مانع ہوگا لیکن جب وہ کلام صفحۂ خاطر سے محو ہو جائے گا تو بسبب اُس رنگ کے جو کلام بلغا کی سیر کرنے سے طبیعت پر خود بخود چڑھ گیا ہے اُس میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جائے گا کہ ویسی ہی ترکیبیں اور اسلوب جیسے کہ اساتذہ کے کلام میں واقع ہوئے ہیں دوسرے لفظوں میں خود بخود بغیر اِس تصوّر کے کہ یہ ترکیب فلاں ترکیب پر مبنی ہے اور یہ اسلوب فلاں اسلوب کا چربہ ہے جیسی ضرورت پڑے گی بنتا چلا جائے گا+

ہمارے نزدیک یہ رائے بہ نسبت پہلی رائے کے زیادہ وقعت

کے قابل ہے اِس میں اُس فائدہ کے سوا جو صاحبِ رائے نے بیان کیا ہے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اساتذہ کا کلام جب تک صفحۂ خاطر سے محو نہ ہو جائے طبیعت اُنہیں اسلوبوں اور پیرایوں میں مقیّد اور محصور رہتی ہے جو اُن کے کلام کو بار بار پڑھنے اور یاد کرنے سے بمنزلہ طبیعت ثانی کے ہو جاتے ہیں اور جن کے سبب سے سلسلہ بیان میں نئے اسلوب اور نئے پیرائے ابداع کرنے کا ملکہ پیدا نہیں ہوتا اور اِس لئے فنِ شعر کو کچھ ترقّی نہیں ہوتی۔

تخیّل کو قوتِ ممیزہ کا محکوم رکھنا چاہئے۔

الغرض شاعر کی ذات میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا تین وصف محقق ہونے ضرور ہیں ایک وہبی یعنی تخیّل یا امیجینیشن اور دو کسبی یعنی صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کی عادت اور الفاظ پر قدرت۔

اب تخیّل کی نسبت اتنا جان لینا اور ضرور ہے کہ اُس کو جہاں تک ممکن ہو اعتدال پر رکھنا اور طبیعت پر غالب نہ ہونے دینا چاہئے کیونکہ جب اُس کا غلبہ طبیعت پر زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ قوّتِ ممیزہ کے قابو سے جو کہ اُس کی روک ٹوک کرنے والی ہے باہر ہو جاتا ہے تو اُس کی یہ حالت شاعر کے حق میں نہایت خطرناک ہے۔ قوّتِ متخیّلہ ہمیشہ خلّاقی اور بلند پروازی کی طرف مایل رہتی ہے مگر قوّتِ ممیزہ اُس کی پرواز کو

محدود کرتی ہے اُس کی خلاقی کے مزاحم ہوتی ہے اور اُس کو ایک قدم بے قاعدہ نہیں چلنے دیتی۔ قوتِ متخیلہ کیسی ہی دلیر اور بلند پرواز ہو جب تک کہ وہ قوتِ ممیزہ کی محکوم ہے شاعری کو اُس سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا بلکہ جس قدر اس کی پرواز بلند ہوگی اُسی قدر شاعری اعلیٰ درجہ کو پہنچے گی۔ دُنیا میں جتنے بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں اُن میں قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی اور قوتِ ممیزہ کی حکومت دونوں ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں اُن کا تخیل نہ خیالات میں بے اعتدالی کرنے پاتا ہے نہ الفاظ میں کجرَوی مگر دوسری صورت میں جبکہ تخیل قوتِ ممیزہ پر غالب آجائے شاعر کے لئے اُس کی پرواز ایسی ہی خطرناک ہے جیسے سوار کے لئے نہایت چالاک گھوڑا جس کے مُنہ میں لگام نہ ہو ہزاروں ہونہار شاعروں کو اِس قوت کی آزادی اور مطلق العنانی نے گمراہ کر دیا ہے اور بعضے جو گمراہ ہو کر پھر راہ راست پر آئے ہیں وہ اُس وقت تک نہیں آئے جب تک کہ قوتِ ممیزہ کو اُس پر حاکم نہیں بنایا۔ قوتِ متخیلہ کی دلیری اور بلند پروازی زیادہ تر اُس وقت بڑھتی ہے جبکہ شاعر کے ذہن میں اُس کو اپنی غذا یعنی حقایق و واقعات کا ذخیرہ جس میں وہ تصرف کر سکے نہیں ملتا جس طرح انسان بھوک کی شدت میں جب معمولی غذا نہیں پاتا تو مجبور بناس پتی سے اپنا دوزخ بھر کر سختی کو

خراب کر لیتا اور اکثر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب قوتِ متخیلہ کو اُس کی مُعتاد غذا نہیں ملتی تو وہ غیر مُعتاد غذا پر ہاتھ ڈالتی ہے خیالات دُور از کار جن میں اصلیت کا نام و نشان نہیں ہوتا تراش کر بہ تکلف اُن کو شعر کا لباس پہناتی ہے اور قوتِ ممیزہ کو اپنے کام میں خلل انداز سمجھ کر اُس کی اطاعت سے باہر ہو جاتی ہے اور آخر کار شاعر کو مہمل گو اور کوہ کندن و کاہ بر آوردن کا مصداق بنا دیتی ہے۔ شاعر کے لئے نیچر کا خزانہ ہر وقت کھلا ہوا ہے اور قوتِ متخیلہ کے لئے اُس کی اصلی غذا کی کچھ کمی نہیں ہے پس بجائے اس کے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر کاغذ کی پھول پنکھڑیاں بنائے اُس کو چاہئے کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں اور خود اپنی ذات میں قدرتِ حق کا تماشہ دیکھے جہاں بھانت بھانت کے اصلی پھول اور پنکھڑیوں کے لازوال خزانے موجود ہیں ورنہ اُن کی نسبت کہا جائے گا۔

جانتا قدرت کو ہے اک کھیل تو ۔۔۔ کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

شمس العلما مولانا شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء میں اپنے وطن مالوف ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سے فراغ حاصل کرکے مشہور ادیب مولوی محمد فاروق صاحب چڑیاکوٹی سے ادب، منطق، فلسفہ کی تکمیل کی۔ پھر فقہ مولوی ارشاد حسین صاحب سے۔ حدیث مولوی احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے اور تفسیر مولوی فیض الحسن صاحب سے پڑھی۔ کچھ دنوں وکالت اور سرکاری ملازمت کرتے رہے۔ ۱۸۸۲ء میں سمیع اللہ خاں صاحب جج کی سفارش سے سرسید نے آپ کو علی گڈھ کالج میں پروفیسر مقرر فرمایا۔ یہاں پروفیسر آرنالڈ صاحب سے فرنچ پڑھی اور علوم جدیدہ سے بھی آگاہی حاصل کی۔ کالج کی ملازمت کے دوران میں آپ نے ٹرکی اور مصر و شام کا سفر کیا۔ جب سفر سے واپس آئے۔ گورنمنٹ نے آپ کی علمی خدمات کا احساس کرکے شمس العلما کے خطاب سے ممتاز فرمایا۔ ۱۶ سال کالج میں کام کرکے ۱۸۹۸ء میں مستعفی ہوئے۔ اس کے بعد حیدرآباد تشریف لے گئے۔ وہاں سلسلۂ آصفیہ میں بصیغۂ تالیف و تصنیف دو سو روپیہ پھر تین سو روپیہ کا منصب ہوگیا۔ عرصہ تک وہاں مقیم

رہے۔ پھر لکھنؤ آکر دارالعلوم ندوہ کی حالت درست کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوئے۔ آخر عمر میں سیرۃ نبوی کی تالیف وتدوین کا اہتمام اپنے ذمہ لیا اور ابھی وہ اختتام کو نہ پہنچی تھی کہ ۲۸ ذیحجہ ۱۳۳۲ ہجری میں بمقام اعظم گڈھ رحلت فرمائی۔ آپ کی تالیفات سے شعر العجم۔ علم الکلام۔ المامون۔ الفاروق۔ سیرۃ النعمان۔ موازنہ انیس و دبیر۔ الغزالی۔ سوانح عمری مولانا روم۔ رسائل شبلی زیادہ مشہور ہیں۔ شعر و سخن سے بھی ذوق تھا۔ فارسی۔ اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مگر آپ کی شہرت زیادہ تر آپ کی فلسفیانہ تنقید اور تحقیق پر مبنی ہے زبان میں سلاست کے ساتھ متانت بھی موجود ہے اُردو میں مثنوی صبح امید اور فارسی میں عقدِ گل ان کے کلام کے نمونے ہیں۔
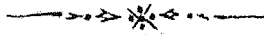
قسطنطنیہ کی اجمالی تاریخ اور مختصر حالات

(ماخوذ از سفرنامہ)

قبل اِس کے کہ میں یہاں کے تفصیلی حالات جُدا جُدا عنوان سے بیان کروں۔ ضرور ہے کہ نہایت مختصر طور پر اس کی قدیم تاریخ اور اس کے ساتھ اِس کی عام موجودہ حالت اجمال کے ساتھ بیان کروں اِس شہر کی ابتدائی تاریخ (یعنی جب وہ بزنطائن کے نام سے پکارا جاتا تھا)۔ نہایت قدیم ہے۔ لیکن جس زمانے سے اس کا نام قسطنطنیہ ہے اِس کو بھی کچھ کم عرصہ نہیں گذرا۔ سنہ ۳۲۶ء میں قسطنطین اعظم نے اِس کی بُنیاد ڈالی اور اُس وقت سے محمد فاتح کے زمانے تک وہ قیصرانِ روم کا پائے تخت رہا۔ انگریزی اور حال کے اِسلامی جغرافیوں میں اِس کے حالات نہایت تفصیل سے ملتے ہیں۔ قدیم اسلامی جغرافیوں میں بھی اس کا ذکر ہے لیکن اِبن بطوطہ کے سوا مجھکو کوئی اِسلامی مصنّف معلوم نہیں جس نے اِس زمانے کے واقعات چشم دید لکھے ہوں اِبن بطوطہ نے سنہ ۷۲۵ھ

میں اس شہر کو دیکھا۔ اُس وقت یہاں عیسائی حکومت تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ "یہ نہایت عظیم الشان شہر ہے اور ایک نہر کے حائل ہونے کی وجہ سے دو حصّوں میں منقسم ہوگیا ہے۔ ایک حصّہ جو نہر کے شرقی کنارے پر ہے استنبول کہلاتا ہے۔ اور قیصرِ روم اور ارکانِ دولت و اُمرا اسی حصّے میں رہتے ہیں۔ دوسرا حصّہ غلطہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں عموماً یورپ کے بڑے بڑے تاجر رہتے ہیں جن کو قیصر بزور اپنی اطاعت میں رکھتا ہے" ابن بطوطہ نے ان سوداگروں کی وسعت تجارت کی تعریف اور ان کے غچلے پن کی ہجو کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب میں اس شہر میں داخل ہوا تو چھوٹی کشتیوں کے علاوہ قریباً سؤ بڑے بڑے جہاز موجود تھے۔ لیکن تمام بازار نہایت نجس اور کثیف ہے۔ اور گرجے تک اس سے مستثنیٰ نہیں ۔

مسلمانوں نے اس کو قرن اوّل ہی میں تسخیر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ چنانچہ سب سے اوّل جس نے اس کی شہر پناہ کے آہنی دروازے پر تلوار ماری وہ عبداللہ بن المطلب خلیفہ ولید بن عبد الملک کا سپہ سالار تھا۔ اس کے بعد اور خلفا و سلاطین نے بھی اس پر حملے کئے لیکن قیصرانِ روم کا خاتمہ محمد فاتح کے ہاتھ سے ہونے والا تھا۔

جس نے سنہ ۸۵۷ھ میں اس عظیم الشان دارالسلطنت پر صلیب کے بجائے علم اسلام بلند کیا۔ اس حیرت انگیز معرکہ کی یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ چونکہ عیسائیوں نے بندرگاہ کا راستہ دریا کی طرف سے روک رکھا تھا۔ ترکوں نے باسفورس اور گولڈن ہارن کے درمیان جو سنگلاخ زمین ہے اُس پہ پانچ میل تک لکڑی کے تختے بچھا دیئے اور جہازوں کو جن میں پہیئے لگائے تھے اُس پر چلا کر تمام فوجیں گولڈن ہارن میں اُتار دیں۔ اُس وقت اِس نامور فاتح کی عمر کُل ۲۳ برس کی تھی۔ اِس فتح کا مادۂ تاریخ "بلدۂ طیبۂ" ہے +

لباس اور وضع بالکل یورپین ہے ظاہری ہیئت سے کسی شخص کا مسلمان یا عیسائی ہونا معلوم نہیں ہو سکتا۔ لال ٹوپی جو ترکوں کا امتیازی لباس ہو سکتا تھا۔ عیسائی اور یہودی سبھی استعمال کرتے ہیں اور اِس وجہ سے دونوں قوموں میں امتیاز کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ طریقہ ایک اعتبار سے تو اچھا ہے۔ کیونکہ دُنیا کی مختلف قوموں میں اِختلاف کے آثار جس قدر مٹتے جائیں تمدن کے لئے مفید ہے۔ لیکن سوشل ضرورتوں میں اِس سے سخت حرج ہوتا ہے مجھ کو اس کی وجہ سے اکثر دُشواریاں پیش آئیں اور ہمیشہ

خیال آتا تھا کہ حضرت عمرؓ نے اگر عیسائیوں کو قومی لباس کی پابندی کا حکم دیا تھا تو بہت بجا کیا۔ تعجب یہ ہے کہ یہاں مذہبی گروہ یعنی علما اور مدرسین بھی یورپ کے اثر سے نہیں بچ سکے۔ ان کے پائجاموں میں پتلون کی طرح بٹن ہوتے ہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ اوپر گھیر ہوتا ہے اور خوبصورتی کے ساتھ چنٹیں ہوتی ہیں کُرتہ یا اچکن کے بجائے صرف ویسکوٹ ہوتا ہے۔ ویسکوٹ کے اوپر عبا پہنتے ہیں اور یہی امتیازی علامت ہے جو اُن کو اور گروہ کے آدمیوں سے الگ کرتی ہے۔ اس میں بھی یورپ کا یہ اثر ہے کہ عبا کے تکمے نہیں لگاتے اور سامنے سے ویسکوٹ کھلا رہتا ہے۔ ترکی ٹوپی عموماً یہ لوگ بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس پر سپید کپڑے کی ایک دھجی لپٹی ہوتی ہے جس کو عربی میں لفہ کہتے ہیں اور وہ اہلِ علم کی خاص علامت خیال کی جاتی ہے۔

یہاں کی عمدہ اور یادگار عمارتیں۔ جامع مسجدیں اور شاہی ایوانات ہیں۔ جامع مسجدوں کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ جداگانہ عنوان سے آگے آئے گا۔ شاہی ایوانات کو یہاں سرائے کہتے ہیں۔ ان کی تعداد بیس یا اکیس ہے اور سب دور دور فاصلہ پر واقع ہیں۔ یہ عمارتیں مختلف سلاطین کے عہد کی ہیں۔ اور نہایت عظمت و شان

کی عمارتیں ہیں - ایک ایوانِ عین لبِ دریا ہے - جو سرتاپا سنگِ رخام کا ہے - اور نہایت وسیع - بلند - خوش نما ہے - حال میں شہنشاہ جرمن سلطان کا مہمان ہوا تھا تو اسی ایوان میں ٹھیرا تھا +

یہ بات نہایت تعجب کی ہے - کہ تمام شہر میں کوئی ٹاؤن ہال نہیں - پبلک گارڈن یعنی باغ عامہ بھی ایسا مختصر ہے - کہ اس عظیم الشان دار السلطنت کے لئے کسی طرح موزوں نہیں - عدالتیں (بجز دو تین کے) سب یکجا واقع ہیں اور اس مجموعی عمارت کو بابِ عالی کہتے ہیں - وزیرِ اعظم کا محکمہ بھی یہیں ہے - یہ عمارتیں چنداں شاندار نہیں ہیں - ہائیکورٹ جس کو یہاں محکمۂ التمیز کہتے ہیں - بابِ عالی سے فاصلے پر ہے - میں اسکے اندر تو نہیں گیا - لیکن باہر سے بڑی شاندار عمارت معلوم ہوتی ہے - پولیس کمشنر کی عدالت غلطہ میں ہے - میں نے اس کی اچھی طرح سیر کی عمارت چنداں قابلِ ذکر نہیں ہے - لیکن نہایت مرتب اور آراستہ ہے - اجلاس کے کمرے میں بیش قیمت ترکی قالین بچھا ہوا ہے - کرسیاں بھی نہایت خوبصورت اور موزوں ہیں - معارف یعنی سررشتۂ تعلیم کا محکمہ بھی میں نے دیکھا - معمولی عمارت ہے لیکن صفائی اور خوش سلیقگی کی وجہ سے خوشنما معلوم ہوتی ہے +
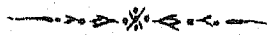
جامع ازہر کی ابتدائی تاریخ

(ماخوذ از سفرنامہ)

یہاں کی قدیم تعلیم۔ دوسرے لفظوں میں جامع ازہر کی تعلیم ہے۔ اس لئے قدیم تعلیم کی کیفیت بیان کرنے کے لئے جامع ازہر کے حالات کافی ہیں۔ یہ وہی جامع ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ کل دنیا میں اس سے قدیم کوئی یونیورسٹی نہیں ہے۔ یہ ایک جامع مسجد ہے اور قاہرہ میں سب سے پہلی مسجد جو تعمیر ہوئی وہ یہی ہے فاطمیین مصر میں سے خلیفہ المعز الدین اللہ کے ایک غلام نے جو سسلی کا رہنے والا تھا اور اپنی قابلیت خداداد سے دولت فاطمیہ کا دست و بازو بن گیا تھا ۳۵۹ھ ہجری میں اس مسجد کی بنیاد ڈالی اور ۳۶۱ھ میں انجام کو پہونچی ۳۷۸ھ ہجری میں خلیفہ عزیز باللہ نے مسجد سے متصل طالب علموں کے لئے کچھ مکانات بنوائے اور ۳۵ طالب علموں کے لئے وظیفہ مقرر کیا۔ حاکم بامر اللہ نے ۴۰۰ھ میں مسجد کی عمارت میں تجدید کی اور اس کے مصارف کے لئے ۱۶۷ دینار منافع سالانہ کی جائداد وقف کی۔

سنہ ۱۱۷ ھ میں امیر طواشی نے یتیموں کے لئے ایک خاص مکتب قائم کیا اور اس کے ساتھ عام طلبا مسجد کے لئے بہت سی جائدادیں وقف کیں رفتہ رفتہ بہت بڑا دار العلم بن گیا یہاں تک کہ ۸۱۸ھ میں اس کے طالب علموں کی تعداد ۷۰۰ سے متجاوز تھی جس میں ہر ملک اور ہر قوم کے اشخاص تھے اور آج تو یہ حالت ہے کہ کثرت طلبا کے لحاظ سے تمام دنیا کی کوئی یونیورسٹی اس کی ہمسری نہیں کر سکتی کم وبیش چار پانچ ہزار طالب علم خود مسجد میں سکونت رکھتے ہیں۔ بہت سے پاس پاس کی مسجدوں میں رہتے ہیں۔ لیکن کھانا یہیں سے ملتا ہے غرض ہر قسم کے طلبا کی تعداد جن کو جامع ازہر سے تعلق ہے بارہ ہزار سے متجاوز ہے۔ ہر ملک کے طالب علموں کے لئے الگ بالا خانے ہیں جن کو یہاں رِواق کہتے ہیں بہت سے طالب العلم بلکہ کثرت سے ایسے ہیں جن کے لئے مکان یا حجرہ کچھ بھی نہیں۔ مسجد کے صحن میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں چھوٹی چھوٹی الماریاں او پر تلے چُنی ہیں۔ یہی اُن کے توشہ خانے ہیں جن میں وہ اپنے کپڑے اور ضروری اسباب رکھتے ہیں سونے بیٹھنے کے لئے تمام مسجد کا صحن پڑا ہوا ہے۔ اوّل اوّل جب میں اس مسجد کی زیارت کے لئے گیا تو دُور سے گونج کی آواز آئی اندر داخل ہوا تو ہر طرف طالب علم ہی طالب علم

نظر آتے تھے۔ جا بجا مدرّسین درس دے رہے تھے۔ اور ایک ایک کے
گرد تیس ۳۰ تیس چالیس ۴۰ چالیس ۴۰ کا مجمع تھا۔ یہ حلقے تیس ۳۰ چالیس ۴۰ سے کم
نہ تھے اور چونکہ پاس پاس تھے اِس لئے اِس قدر شور و غُل تھا کہ کان
پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی۔ مجھکو یہ خیال ہوا کہ آج کوئی خاص دن
ہے۔ اور اس وجہ سے کثرت سے طلبا جمع ہو گئے ہیں۔ لیکن دو چار
روز رہکر یہ معلوم ہوا کہ یہ معمولی حالت ہے مجھکو خیال ہوا کہ اِس ہنگامہ
میں جمعیّتِ خاطر ایک طرف مدرّسین کی آواز بھی طالب علم کے کان
تک پہونچتی ہے یا نہیں۔ جن جن مُلکوں مثلاً شام۔ مغرب۔ جزیرہ
عِراق۔ بخارا۔ خُراسان۔ افغانستان۔ ہندوستان وغیرہ کے
طالبِ علموں کے لئے رِواق بنے ہیں۔ وہاں کے لوگ ہمیشہ
سوداگروں کے ذریعہ سے سالانہ کچھ رقم بھیجتے ہیں جو اِن طلبا کو
جیب خرچ کے طَور پہ دیجاتی ہے۔ معمولی کھانا خود ازہر سے ملتا
ہے۔ لیکن چونکہ صِرف روٹیاں مِلتی ہیں۔ اِس لئے سالن کا اہتمام
اُن کو خود کرنا پڑتا ہے بہت سے طلبا جن کو چار چار پانچ پانچ روٹیاں
ملتی ہیں۔ نان بائی کو دو تین روٹیاں دیکر اِس کے بدلے سالن
لے لیتے ہیں اور اِس طرح اُن کے جیب خرچ پر چنداں بار نہیں
پڑتا۔ روٹیوں کی تقسیم کا طریقہ یہ ہے کہ وقتِ معیّن پر طلبا کا ایک گروہ

بازار میں (جو مسجد کے سامنے ہے) دو رُویہ صف باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور روٹیاں تقسیم ہونی شروع ہوتی ہیں۔ ایک گروہ کے بعد دوسرا گروہ آتا ہے۔ اور یہ سلسلہ کئی گھنٹے تک قائم رہتا ہے طالب علموں کے ہاتھوں میں کوئی تولیا یا رومال نہیں ہوتا جس طرح بھیک منگے جو کچھ ملتا ہے ہاتھ پھیلا کر لے لیتے ہیں۔ ان طالب علموں کا بھی یہی حال ہے +

تعدادِ مدرّسین

مدرّسین کی تعداد چالیس ۴۰ سے زیادہ ہے۔ مدرّس اوّل جو شیخ ازہر کہلاتا ہے۔ اور جس کی تنخواہ چھ سات سو ماہوار سے کم نہیں ہوتی نہایت معزز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خود حکومت اُس کا پاس کرتی ہے۔ اِس مدرسے کا مجموعی خرچ دو تین لاکھ روپئے سالانہ سے کم نہیں سنہ ۱۸۹۴ء میں علاوہ اِس رقم کے سر رشتۂ تعلیم سے دو لاکھ سالانہ کی رقم اور منظور ہوئی +

مجھکو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامعِ ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا۔ کسی چیز سے نہیں ہوا۔ ایک ایسا دارالعلوم جس میں دُنیا کے ہر حصّے کے مسلمان جمع ہوں جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو جس کے طالبِ علموں کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو اُس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ

اُمید نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہونچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے۔ اور کرتا جاتا ہے۔ تربیت اور معاشرت کا جو طریقہ ہے اور جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں اُس سے حوصلہ مندی۔ بلند نظری۔ جوشِ ہمت۔ غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے۔ میں نے یہاں ایسے ایسے طلبا دیکھے ہیں۔ جن کے عزیز اور نہایت قریب عزیز (چچا۔ ماموں وغیرہ) خود اُسی شہر میں بڑے بڑے ممتاز عہدوں پر ہیں۔ اور اُن کی تمام ضروریات کے متکفل بھی ہیں۔ تاہم چونکہ یہ طلبا ازہر میں رہتے ہیں اس لئے ان کو عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا شرم نہیں آتی۔ طالب علموں کی دناءت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسے کی ترکاری خریدتے ہیں تو کنجڑے کو قسم دلاتے جاتے ہیں کہ بِرَاسِ سَیِّدِنَا الحُسَینِ یعنی تجکو امام حسین کے سر کی قسم واجبی قیمت بتانا! کیا اِس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت و شان بڑھائیں گے؟

قاہرہ کی قدیم یادگاریں

(ماخوذ از سفرنامہ)

آثارِ قدیمہ کے لحاظ سے کوئی شہر اِس شہر کی ہمسری نہیں کرسکتا
سچ یہ ہے کہ یہاں کی ایک ایک ٹھیکری قدامت کی تاریخ ہے۔ سوادِ
شہر کے ویرانوں میں اِس وقت تک سینکڑوں خزف ریزے ملتے
ہیں جن پر کئی کئی ہزار سال قبل کے حروف و نقوش کندہ ہیں۔
مجھکو اِتنا وقت بلکہ سچ یہ ہے کہ اِتنی ہمّت کہاں تھی کہ تمام قدیم یادگاروں کی سیر
کرتا۔ البتہ چند مشہور مقامات دیکھے اور اُنہیں کے حال پر اکتفا کرتا ہوں +

اہرام

اہرام۔ یہ وہ قدیم مینار ہیں جن کی نسبت عام روایت ہے
کہ طوفانِ نوحؑ سے پہلے موجود تھے۔ اور اِس قدر تو قطعی طور سے
ثابت ہوا ہے۔ کہ یونان کی علمی ترقّی سے اِن کی عمر زیادہ ہے۔
کیونکہ جالینوس نے اپنی تصنیف میں اِس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مینار
نہایت کثرت سے تھے یعنی دو دن کی راہ میں پھیلے ہوئے تھے۔
صلاح الدین کے زمانہ میں اکثر ڈھا دیئے گئے اِن میں سے جو باقی

رہ گئے اور جن پر خاص طور سے اہرام کا اطلاق ہوتا ہے صرف تین
ہیں۔ جو سب سے بڑا ہے اُس کی لمبائی ۴۸۰ فیٹ یعنی قطب صاحب
کی لاٹ سے دُگنی ہے نیچے کے چبوترہ کا ہر ضلع ۷۶۴ فیٹ ہے۔
مینار کا مکعب ۸ کروڑ نوّے لاکھ فیٹ ہے اور وزن ۶۸ لاکھ چالیس
ہزار ٹن۔ اِس کی تعمیر میں ایک لاکھ آدمی بیس برس تک کام کرتے
رہے۔ جڑ میں تیس تیس فیٹ لمبے اور ۵۔۵ فیٹ چوڑے پتھر کی
چٹانیں ہیں۔ اور چوٹی پر جو چھوٹی سے چھوٹی ہیں ۸ فیٹ کی ہیں۔ اُنکی
شکل یہ ہے کہ ایک نہایت وسیع مربّع چبوترہ ہے اس پر ہر طرف سے
کسی قدر سطح چھوڑ کر دوسرا چبوترہ ہے۔ اِسی طرح چوٹی تک اوپر
تلے چبوترے ہیں اور ان چبوتروں کے بتدریج چھوٹے ہوتے
جانے سے زینوں کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ پتھروں
کو اس طرح وصل کیا ہے۔ کہ جوڑ یا درز کا معلوم ہونا تو ایک طرف
چونہ یا مصالح کا بھی اثر نہیں معلوم ہوتا۔ اِس پر اِستحکام کا یہ حال ہے
کہ کئی ہزار برس ہو چکے اور جوڑوں میں بال برابر فصل نہیں پیدا
ہوا ہے۔ اِن میناروں کو دیکھ کر خواہ مخواہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جرِ ثقیل
کا فن قدیم زمانہ میں موجود تھا۔ کیونکہ اِس قدر بڑے بڑے پتھر اتنی
بلندی پر جرِ ثقیل کے بغیر چڑھائے نہیں جا سکتے اور اگر اس ایجاد

کو زمانۂ حال کے ساتھ مخصوص سمجھیں تو جرِ ثقیل سے بھی بڑھکر کسی عجیب صنعت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

اِن میناروں میں سے ایک جو سب سے چھوٹا ہے کسی قدر خراب ہو گیا ہے۔ جس کی کیفیت یہ ہے کہ سنہ ۵۹۳ ہجری میں مَلِک العزیز (پسر سُلطان صلاح الدین) نے بعض احمقوں کی ترغیب سے اُسکو ڈھانا چاہا چنانچہ دربار کے چند معزز افسر اور بہت سے نقب زن اور سنگتراش اور مزدور اِس کام پر مامور ہوئے۔ آٹھ مہینے تک برابر کام جاری رہا اور نہایت سخت کوششیں عمل میں آئیں ہزاروں لاکھوں روپیہ برباد کر دیے گئے لیکن بجز اِس کے کہ اُوپر کی استرکاری خراب ہوئی یا کہیں کہیں سے ایک آدھ پتھر اُکھڑ گیا اور کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ مجبور ہو کر مَلِک العزیز نے یہ ارادہ چھوڑ دیا۔

ابو الہول

اہرام کے قریب ایک بہت بڑا بُت ہے جس کو یہاں کے لوگ ابو الہول کہتے ہیں۔ اِس کا سارا دھڑ زمین کے اندر ہے۔ گردن اور سر اور دونوں ہاتھ کھُلے ہوئے ہیں۔ چہرہ پر کسی قسم کا سُرخ روغن ملا ہے جس کی آب اِس وقت تک قائم ہے۔ اِن اعضا کی مناسبت سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ پورا قد ساٹھ ستّر گز سے کم نہ ہوگا۔ باوجود

اِس غیر معمولی درازی کے تمام اعضا ناک کان وغیرہ اِس ترتیب اور مناسبت سے بنائے ہیں کہ اعضا کے باہمی تناسب میں بال برابر کا فرق نہیں ٭

عبداللطیف بغدادی سے کسی شخص نے پوچھا کہ "آپ نے دنیا میں سب سے عجیب تر کیا چیز دیکھی" اُس نے کہا کہ "ابوالہول کے اعضا کا تناسب" کیونکہ عالمِ قدرت میں جس چیز کا نمونہ موجود نہیں اُس میں ایسا تناسب قائم رکھنا آدمی کا کام نہیں ٭

خان بہادر میر ناصر علی

خان بہادر میر ناصر علی صاحب کی پیدائش ۱۸۴۷ء میں دہلی میں ہوئی۔ آپ ایک معزز خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں آپ کے دادا ریاست بھوپال کی رزیڈنسی میں میر منشی رہے۔ اور آپ کے نانا فوج میں صوبہ دار بہادر تھے۔ آپ کے والد مولوی سید ناصر الدین ابوالمنصور دہلی کے مشہور ادیب تھے۔ اور آپ کے بھائی میر نصرت علی زمانہ سابق میں ایک نامور اخبار نکالتے تھے ۱۸۶۷ء میں آپ دہلی گورنمنٹ کالج سے امتحان دیکر نان پارہ ضلع بہرائچ میں مدرس اول مقرر ہوئے لیکن سال بھر کے بعد آپ کی خدمات محکمہ نمک شمال ہند میں منتقل ہوئیں اور اُس محکمہ میں تقریباً ۳۴ سال تک نہایت نیکنامی کے ساتھ اپنے منصبی فرائض انجام دیتے رہے۔ پنشن پانے کے بعد بھی گذشتہ چار پانچ سال سے گورنمنٹ پنجاب نے آپ کو ریاست پاٹودی ضلع گوڑگانوں میں دیوان کے عہدہ پر تعینات فرمایا ہے۔ آغاز عمر آپ کا لکھنؤ میں اور باقی عمر دہلی اور نواح دہلی میں بسر ہوئی۔ شروع سے آپ کو اردو لکھنے کا بیحد شوق رہا اُن کا ہمیشہ سے خیال ہے کہ بلحاظ نازک خیالی و

پاکیزہ بیانی زبانِ اُردو کسی قدیم اور جدید زبان سے کم نہیں ہے۔ یہ دیکھکر کہ اُردو کی طرف توجہ کم ہوتی جاتی ہے آپ اِس شکایت کو مٹانے کے خیال سے مختلف اخبار اور رسالہ وقتاً فوقتاً جاری کرتے رہے۔ پہلے تیرھویں صدی۔ زمانہ افسانۂ ایامِ ناصری وغیرہ رسالہ نکالتے رہے اور آخر میں صلائے عام آپ کی کوشش سے شایع ہونے لگا۔ باوجود اِس کے کہ اِس وقت آپ کی عمر ۷۰ برس کے قریب ہے اِس عمر میں بھی دیوانِ ریاست کے فرائضِ منصبی کے سوا پانچ چھ گھنٹہ روزانہ آپ کتب بینی میں اور مضمون نگاری میں صرف کرتے ہیں۔ آپ کا طرز نثر کے لکھنے میں نہایت سادہ اور دلفریب ہے اور علم تواریخ اور فنونِ لطیفہ میں بھی آپ کو خاص دخل ہے۔ چنانچہ جب اعلیٰ حضرت شاہنشاہِ معظّم کی تقریب تاج پوشی میں دہلی کے قلعۂ معلّٰی میں عجائب خانہ ترتیب دیا گیا تو آپ اُس کے اہتمام میں شریک کئے گئے اور آپ کو حضورِ والا شاہنشاہِ معظّم کے خدمت میں پیش ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کا کلام اِس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ ہر قسم کے مضامینِ علمی۔ تواریخی۔ فلسفانہ کس خوبی سے اُردو زبان میں لکھے جاسکتے ہیں ؎
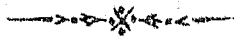
خیال بمقابلۂ زبان

خیال وہ چیز ہے جو ذہن میں آئے اور زبان اُس کے اظہار کا طریقہ ہے۔ زبان اچھی ہو تو کیا کہنا اگر اچھی نہ ہو تو بھی اگر خیال اچھا ہے تو اُجڑے گھر کا چراغ ہو جاتا ہے ؎

وہ داغ دیکھ کے بولے دلِ شکستہ کا اُجڑ گیا ہے یہ گھر اور چراغ جلتا ہے

ہماری زبان کی نسبت مدت سے یہ شکایت چلی آتی ہے کہ اِس میں مشکل مضامین کے ادائے بیان کی گنجایش نہیں۔ صلائے عام نے اگر کچھ نہیں کیا تو اتنا ضرور کر دکھایا کہ مشکل سے مشکل مضمون بھی اِس خوبی سے بیان کئے جاتے ہیں کہ بے تقاضے پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

الٰہی کس نے کہا ہے نہ بولنا ہم سے کہ آج دل کی طرح سے ہے بیقرار زباں

اجازت آپ جو دیں دوڑ کر کلام کرے کرے نہ جُنبشِ لب کا بھی انتظار زباں

یہ خوبی بھی تو زبان کی سمجھئے جس میں ہر شخص جو اُردو جانتا ہے شریک ہے مگر صلائے عام میں خاص بات یہ ہے کہ اِس میں خیال کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ زبان کے قائل تو ایسے لوگ بھی ہیں جو لیاقتِ علمی سے خالی ہوں مگر خیال کی داد دینے کے لئے علم و لیاقت کی ضرورت

ہے۔ اس لئے اہلِ علم وکمال میں خیال کی خوبی کو زبان کی خوبی پر ترجیح دیجاتی ہے۔ زبان کے سمجھنے والے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ زبان کا سمجھنا آسان ہے۔ مضمون پیدا کرنے میں جو خونِ جگر کھانا پڑتا ہے اُس کے سمجھنے کے لئے دل ودماغ چاہیئے اور دل ودماغ بختِ[۱۵] عُرفی کی طرح ہر وقت بازار میں نہیں ملتے۔

یہی وجہ ہے کہ عوام میں اندر سبھا کی غزلیں زیادہ زبان زد دیکھئے گا اور عُرفی کے قصیدے کم۔ جو لوگ عوام کی زبان اختیار کریں جلد مشہور ہو جائیں گے۔ خاص کی زبان دیر میں سمجھ میں آئے گی۔

اُردو لٹریچر میں از رُوئے زبان بہت کچھ لکھا گیا۔ مگر اساتذہ کو چھوڑ کر دیکھئے تو اس کی شاعری میں اب صرف زبان کا لطف رہ گیا ہے: نیا مضمون نکالنا شبِ ہجر کا کاٹنا ہے۔ نثر میں فسانۂ عجائب اور اُردوئے معلّٰی پر اپنے اپنے طرز کی خوبیاں ختم ہیں کہ ان سے بہتر کیا کوئی لکھے گا؟ لیکن اُردو کی ساری لٹریچر دیکھ جائیے نیا خیال ذرا مشکل سے ملے گا۔ زبان کی خوبی جیسا کہ میں عرض کر چکا بڑی چیز ہے مگر خیال کی خوبی اُس سے بھی اچھی سمجھئے۔ خیال کو کسی حسین سے تشبیہ دیجئے تو زبان محض آرائشِ لباس سے زیادہ نہیں سمجھی جائے گی۔ دُنیا کی پاکیزہ

[۱۵] جہاں بگشتم و دردا بہیچ شہر و دیار — نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

زبانوں میں بڑی ضرورت خیال کی سمجھی جاتی ہے۔ اِس کے بعد اندازِ بیان
کی ہ نظم میں تشبیہ و استعارہ میں ہم نے وہ کمال پیدا کیا کہ یہ کمال ہماری
زبان کا حصّہ ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ پابندیاں ایسی لگا دیں کہ وہی خوبی
ہزار بار دکھائی گئی۔ یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے ہماری نگاہ میں اجیرن معلوم
ہونے لگی ٭ علاوہ اِس کے نظم میں جب ہم اِس قدر دل و دماغ صرف
کر بیٹھے تو اب نثر کے لئے کیا رہ گیا ٭ یہ میں پہلے کہہ چکا اور پھر کہتا ہوں کہ
زبان کی خوبی یہی نہیں ہے کہ اس کا روزمرّہ بے عیب ہو۔ خیال بھی پاکیزہ
چاہیے ٭ اُردو لٹریچر میں مجھے زبان کی شکایت نہیں۔ شکایت ہے تو خیال
کی۔ کہ خیال بہت ہی معمولی ہوتے ہیں ٭ لڑائی ہوتی ہے تو دہلی اور لکھنؤ
کے محاوروں پر۔ یہ فکر نہیں کہ جو کچھ خیال میں ہے یہ بھی زبان سے نکالنے
کے لائق ہے یا نہیں؟ دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو فرق میرے ذہن میں
آیا یہ ہے کہ دہلی میں سقّہ جو نل سے مشک بھر رہا ہے دوسرے سقّے سے جس
زبان میں باتیں کر رہا ہے اُسی زبان میں لال قلعہ تک باتیں سُنتے چلے
جائیے۔ اس لئے دہلی کی زبان میں بے تکلّفی ہے ٭ لکھنؤ میں خاص کی
زبان اور۔ اور عوام کی اور ہے جو تکلّف سے خالی نہیں ٭ مگر خیال میں نہ
یہاں کوئی بات دیکھی نہ وہاں ٭ ساری فسانۂ عجائب دیکھ جائیے یہ نہیں
یاد رہتا کہ نیا مضمون کونسا تھا اور ساری اُردوے معلّٰی پڑھ کر یہی یاد رہا

کہ میاں تمہارا خط نہیں آیا۔ تم کیسے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ برخلاف اِس کے اور ملکوں کی زبانوں میں خیال کی فکر زیادہ رہتی ہے کہ ہر بات میں نیا مضمون پیدا ہو ⁂

آئینہ کو ہم حیران باندھنے سے زیادہ نہ کہہ سکے۔ یُونان کے کسی شاعر نے اِس میں ایک نئی بات پیدا کی کہ کوئی حسین جس کی جوانی کا انحطاط قریب ہے زہرہ کے مندر پر آئینہ چڑھانے گئی۔ چڑھاتے وقت کہتی ہے کہ آئینہ کی اب مجھے ضرورت نہیں۔ جیسی میں تھی وہ صورت تو اب آئینہ میں کاہیکو نظر آئے گی۔ جو شکل ہونے والی ہے اُس کو دیکھکر کیا کروں گی؟ جوانی کے بعد جو میری صورت ہوگی وہ مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی جیسی تھی پھر دکھائی دے چکی ⁂ اب آئینہ کو رکھکر کیا ہوگا؟ یہی آئینہ جو حسینوں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ جوانی کے بعد اس کی شکل سے نفرت ہو جائیگی ⁂

ایک کم سِن لڑکی جو اَب تک گُڑیوں سے کھیلتی رہی صغیر سِنی کی شادی میں از روئے رسم مندر میں پُوجا کے لئے گئی ⁂ اور لوگ جہاں چڑھاوے کی چیزیں لے گئے تو یہ اپنی گُڑیاں ساتھ لیتی گئی کہ اب ان سے کھیل چکی ان کو چڑھانے کے لئے لائی ہوں ⁂ دیبی جی جن کو گھر کے جھگڑوں سے فرصت ہے۔ گُڑیوں سے کھیلیں گی ⁂ شادی کے بعد کھیلنا معلوم ⁂

یونان میں رسم تھی کہ لڑکے کے بالغ ہوتے تک سر کے بال نہیں مُنڈائے جاتے تھے۔ مونڈن کے وقت ماں باپ نے سر کے بال درگاہ پر چڑھاتے وقت کہا کہ سیاہ بالوں کی عوض اِسے خدا اتنی عمر دے کہ اِس کا سر سپید ہو جائے ✤

عقل نے عشق سے کہا کہ اکیلے تو میں تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں کہ ایک کی لڑائی ایک سے برابر کی لڑائی ہے مگر تیرے ساتھ اگر دخترِ رز ہو گئی تو پھر تیرا مقابلہ مشکل ہے ✤

حُسن وفا کے بغیر بیکار ہے کہ مچھلی کے شکار میں نِری بنسی سے شکار نہیں ہو سکتا۔ کانٹا نہ ہو تو بنسی پانی کے اوپر تیرا کرے گی اور مچھلیاں خبر نہ ہوں گی ✤

شکاری بھاگتے ہوئے شکار کے پیچھے پیچھے کوہ و بیابان میں دوڑتے ہیں مگر مارا ہوا جانور مِل جائے تو اُس کی طرف دیکھتے بھی نہیں یہ چال عشق ہرجائی کا ہے جو گھر کی پارسا عورت کو چھوڑ کر بازار میں پھرتا ہے ✤

ایک نوجوان کسی راہِ خدا کے شہید کے مزار پر پھول پان چڑھانے لے گیا۔ قبر سے آواز آئی کہ احمق یہ چڑھاوا ہمیں نہیں چاہیئے۔ اِسے واپس لیجا: یہ چیزیں کسی شاہدِ بازاری کو دیدینا۔ یہاں ڈھال تلوار چاہیئے جو بازار سے خریدی ہوئی نہیں بلکہ خدا کی راہ میں کام آئی ہو تو لے آ ✤

کھیت نے زمیندار سے کہا کہ تجھ سے پہلے میں تیرے باپ کا تھا اب تیرا ہوں۔ تیرے بعد تیرے بیٹے کا پھر پوتے کا اور پر پوتے کا تو مجھے اپنا موروثی سمجھتا ہے۔ تیرے بعد بیٹے نے اگر بیچ ڈالا تو دوسرے کا ہو جاؤنگا۔ مگر یہ سب اپنی بیوقوفی سے مجھے اپنا سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے۔ میں نہ تیرا ہوں نہ کسی کا۔ نصیب کا اور بخت کا زرخرید غلام ہوں۔

جو نعمتیں کہ انسان کے لئے مناسب ہیں مانگے اور بے مانگے خدا دیتا ہے۔ جو ہمارے لئے مضر ہیں مانگے سے بھی نہیں دیتا۔ یہ نہ دینا اُس کی عین رحمت ہے۔

انسان اپنی زندگی اس طرح بسر کرے کہ انتظام میں یہ سمجھے گویا کبھی مرنا ہی نہیں اور آرام میں یہ سمجھے کہ کل کی بھی اُمید نہیں۔

نیکی کے آغاز میں پہاڑ اور گھاٹیاں اور ہزاروں نشیب و فراز ہیں جو نہایت دشوار گذار ہیں۔ مگر ان سے اُترتے ہی آرام کے دروازہ تک تمام راستہ صاف ہموار پڑا ہوا ہے کہ آنکھیں بند کئے چلے جائیے۔

ایک خونی کسی دیوار کے نیچے سو رہا تھا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے کہ یہاں سے بھاگ۔ اس کی آنکھ کھل گئی: وہاں سے اُٹھ کر بھاگا اس کے بھاگتے ہی دیوار گری۔ اس نے اپنے

دل میں کہا کہ خدا نے مجھ پر بڑا رحم کیا کہ گرتی دیوار سے بچا لیا۔ ورنہ دب کر مرجاتا ÷ آواز آئی کہ ہم نے اِس موت سے اِس وقت تجھے بچا لیا کہ یہ آسان تھی تجھے اُس تکلیف کی موت سے سب کے سامنے مارنا منظور ہے جسے پھانسی کہتے ہیں ÷ دیوار سے دب کر مرنا مرگِ ناگہاں میں سمجھا جاتا تیرے اعمال کی سزا میں مارنے کے لئے تجھ کو چھوڑا ہے تاکہ جلّاد کے ہاتھ سے مارا جائے ÷

ایک بچّے کی قبر پر کندہ ہے کہ میرے ماں باپ میرے لئے نہ روئیں کہ اگر میں نے زندگی کا لُطف نہیں دیکھا تو اس کی مصیبتیں بھی نہیں اُٹھائیں۔ اِدھر کی کسر اُدھر نکل گئی ÷

کسی کے غم میں موت سے کوئی کہہ رہا ہے کہ تو مرنے والے کے ساتھ تو زبردستی کر گئی بھلا میرے ساتھ تو کر۔ کہ مرنے والے کی یاد چھین تو لے ؟

دنیا میں ہم فانی ہیں تو جو کچھ ہم سے متعلق ہے وہ بھی فانی ہونا چاہئے کہ جوہر اور عرض کا ساتھ ہے مگر لطف یہ ہے کہ اگر سامان رہ بھی جائے تو ہم نہیں رہ سکتے ÷ یہ نئی بات ہے کہ جوہر ندارد اور عرض قائم ÷

مجھے اُن پر افسوس نہیں آتا جو مر گئے۔ اُن پر افسوس آتا ہے جو مرنے کے نام سے ڈر رہے ہیں ÷

پیری و شباب ! مجھے اپنے اوپر افسوس آتا ہے کہ میں نے شباب کو

جاتے اور پیری کو آتے اپنی آنکھوں سے دیکھا+

پروردگار کی نعمتیں عجیب و غریب ہیں۔ آسمان و زمین۔ سورج اور چاند۔ دریا اور پہاڑ جنگل اور ہوا۔ یہ کسی کو دغا نہیں دیتے+ دغا دیتی ہیں تو انسان کی آرزوئیں کہ ایک بھی اس کی مرضی کے موافق پوری نہیں ہوتی+

تو مرا۔ پھر تیرا کچھ نہیں: جو تیرے پیچھے رہ گئے اُن کا سب کچھ ہے+

نصیب و تمنا! رخصت! میں منزل پر پہنچ گیا+ تم نے مجھے بہت بہکایا۔ میں تمہارے پیچھے پھرتے پھرتے تھک گیا۔ اب اوروں کی باری ہے+ اوروں کو دام فریب میں لاؤ+

یہ چند خیال میں نے اہلِ علم و کمال کی طبع آزمائی کے لئے جمع کردئے کہ ان پر مضمون لکھیں+ یہ خیال نظم کی خوبیاں مانگتے ہیں جن سے میں عاری ہوں شعراءِ اردو ان کو نظم میں ادا کریں تو ان کا لطف دوبالا ہوجائے+ میں نے بُری بھلی اردو میں ان کا مطلب ادا کردیا اب آپ جانیں اور آپ کی نازک خیالیاں ؎

کیوں خاک میں ملاتے ہو رفتارِ ناز سے

مٹّی میں لوٹتا ہے دوپٹہ اُٹھایئے۔

شہرِ خموشاں

دنیا کے تمام شہروں میں پرانی دلّی سے زیادہ کہیں قبریں نہونگی جو یادگارِ روزگار رہوں۔ دلّی کی برکتوں میں یہاں کی قبریں سمجھی جاتی ہیں کہ بڑے بڑے اولیا اللہ کے مزاروں اور بادشاہ و وزیر و امیر کی قبروں کی گنتی نہیں۔ جنھوں نے ہزاروں لڑائیاں فتح کیں مرے پڑے ہیں جنھوں نے تمام عمر عیش کیا گرے پڑے ہیں +

ایک صاحب کی فرمایش سے مجھے قطب الملک سید عبداللہ خاں کی قبر کی تلاش تھی + سُنا ہے کہ کسی شاہدِ بازاری کے پہلو میں جس سے انہیں محبت تھی دفن ہوئے تھے + یہ وہ شخص ہے جو فرخ سیر کا وزیر تھا۔ یہ اور ان کے بھائی بادشاہ تو کیا چیز ہے "بادشاہ گر" تھے کہ جسکو چاہا بادشاہ بنا دیا + ان کی قبر کا نشان تو ان کی تقدیر کی طرح شاید مٹ گیا مگر اس خیال میں انسان کی ہستیِ ناپایدار کا نقشہ میری آنکھوں میں پھر گیا + اُس لعبتِ ناز کی تصویر جس کے پہلو میں وزیرِ فرخ سیر سو رہا ہے قطب الملک کی لوحِ دل پر اس صورت سے کھنچی نظر آئی کہ عمر خیام کی طرح ایک ہاتھ میں ساغر ہے مگر

اَوندھا اور دوسرے میں وزیر کا نقشہ لوحِ نسیان پر ایسے دھندلے خطوں میں کھنچا ہوا ہے کہ پڑھا نہیں جاتا ۔

اِس ہستیِ بے ثبات کی طرح دنیا میں قبروں کی ناپائداری بھی افسوس کے قابل ہے ۔ قبروں سے پس ماندوں کے لئے نشان بنا رہنے کا فائدہ ہو تو مرنے والے کے واسطے بے کار ہے ۔ ہماری خاک سے سبزہ و گھاس اگر اُگے تو ہم کے لئے زیادہ بکار آمد ہے ۔ اجزاء لطیف ہوا میں اور کثیف مٹی میں ملکر لالہ و گل پیدا کریں تو کیا کہنا ! جُزوِ لطیف کا عالمِ بالا کو پہنچنا ہماری ہستی کی معراج اور خاک سے سبزہ و گیاہ کا اُگنا عجیب لطف ہے کہ ہر بہار و خزاں میں عالمِ ہستی و فنا کی تصویر پیشِ نظر رہے گی ۔ نئی کو پلیں عالمِ ایجاد کا نمونہ سمجھئے کہ چند روز بہار دکھا گئیں اور برگِ خزاں رسیدہ ہماری خزاں کا ثبوت کہ خدا جانے کہاں گئے اور کہاں نہیں ؟

انسان کے لئے اپنی مصیبت کا بھولنا بڑی نعمت ہے ۔ مرکر فنا ہو جانے میں گویا اپنی مصیبت کو بھول جاتا ہے ۔ ابنائے زماں کے ہاتھوں انسان ایسا نالاں جاتا ہے کہ ہم اُسے یاد کریں تو کریں ۔ مرنے والا ہمیں کیا خاک یاد کرے گا ؟ سبب یہ کہ جب کسی کو دنیا میں آرام نہیں تو اس سے چھٹ کر دنیا کا خیال رکھنے کی وجہ

سمجھ میں نہیں آتی انسان کو جب اپنی ہستی کا مآل معلوم نہیں تو یہاں آکر بہت سے گورکھ دھندے سوچتا ہے اور جب دل کو تسلی نہیں ہوتی تو رات دن انہیں کے بنانے اور بگاڑنے کی فکر میں لگا رہتا ہے + رنج و مصیبت سے بچنے کی فکر میں عیش و آرام کی تلاش کرتا ہے۔ نیکی پر قابو نہیں تو برائیاں کرتا ہے اور زندگی سے عاری ہو کر چلا جاتا ہے + جانے کے بعد اس دارِ محن کی طرف منہ پھیر کر نہیں دیکھتا + مرے ہوؤں میں اقبال و نحوست۔ خوش حالی و محتاجی عیش و مصیبت۔ پیری و جوانی کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا جس طرح مرغانِ چمن جو صبح کو چہچہا رہے تھے۔ غروبِ آفتاب کے بعد چپ ہو جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد انسان نہ اپنی کہتا ہے نہ ہماری سنتا ہے اور جس طرح بوئے گل باغ سے نکل کر پھر باغ میں نہیں آتی۔ انسان کو پھر دنیا کی طرف منہ کرتے نہیں دیکھا۔ اسی لئے قیامت کی ضرورت ہوئی کہ ایسے روٹھے قیامت ہی کو منیں تو منیں + دولتمندوں کے لئے قیامت ہو یا نہ ہو مگر مصیبت زدوں کے لئے جو دنیا سے بیزار ہو گئے قیامت کا نہ ہونا قیامت ہے +

مجھے گمان تھا کہ کتبہ کے بغیر مرد و عورت کی قبر کا امتیاز کرنا مشکل ہے مگر پرانی قبروں میں یہ امتیاز دیکھنے میں آیا کہ عورت کی

قبر پر تختی بنی ہوتی ہے اور مرد کی قبر پر بند قلمدان کی شکل۔ اس امتیاز کی وجہ مجھے معلوم نہ ہوئی۔ جن صاحبوں کو اس کی تحقیق ہو از راہِ کرم صلائے عام میں لکھیں۔

ایک بات اور عرض کرنے کے لائق یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کے ساتھ سلوک کرنے کے طریقوں میں قبرستان کا رواج سب سے زیادہ بکار آمد ہے کہ قبر سے اچھی یادگار بنی رہتی ہے اور تاریخ کے طور پر جو کتبے نظم یا نثر میں اہلِ اسلام کی قبروں پر لکھے گئے عبرت کے لئے ان سے بہتر کوئی سامان دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ وہ لسانِ خموشاں ہے جو عمر بھر جینے اور مرنے کا حال آیندوروندگان سے دیکھتے ہی کہہ دیتا ہے ؎

ترا جویم ز ہر نقشے کہ دانم
توئی مقصود ہر حرفیکہ خوانم

ابجد کے قاعدہ سے تاریخ نکالنی مسلمانوں کی ذہانت اور دماغ کا بڑا ثبوت ہے کہ کسی زبان میں یہ کمال اور خوبی دیکھنے میں نہ آئی۔ یہ فن اہلِ اسلام کا خاص حصہ ہے۔ اس فن میں مسلمان تمام دنیا سے بازی لے گئے۔

اس کے سوا موت اور موت کے بعد کے متعلق سب سے زیادہ لٹریچر مسلمانوں میں ہے۔ یہ مضمون ایسے ایسے پاکیزہ ہیں کہ کسی زبان میں اگر ہونگے تو اسی قدر ہوں گے مگر اس سے زیادہ اور ایسے دلکش نہ ہوں گے۔ مثلاً یہ روایت سننے کے لائق ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رح نے بڑی عمر میں وفات پائی۔ قبر میں منکر نکیر نے ان سے سوال کیا کہ بڑے میاں! اللہ میاں کے لئے

کیالائے ہو"؟ حضرت نے جواب دیا کہ "گدائے چشم بردر جب بارگاہ سلطانی پر پہونچے تو اُس سے یہ نہیں پوچھتے کہ کیالایا ہے؟ بلکہ یہ پوچھنا چاہئے کہ کیا مانگتا ہے؟ مجھے تو اپنا حق خدمت درکار ہے کہ سگ نفس جو میرے دل میں بٹھا دیا گیا تھا اُسکی نگہبانی میں ایک عمر بسر ہوگئی اس خدمت سگبانی کا حق ملنا چاہئیے" ؎

چشم رحمت برکشا موئے سپید من نگر زانکہ از شرمندگی روئے سیاہ آوردہ ام

آپ مارے اور مردہ سے باز پرس ؟ ؎

ساقیا گرد سر ناز تو گردم کہ اگر بشکند جام بدست تو زمینا رنجی

وعدۂ وصل بفرداست ولے می ترسم کہ چو فردا شود از وعدۂ فردا رنجی

تمام عمر تو ہم نے جو کچھ چاہا ہمیں کرنے دیا مرنے کے بعد اک ذرا عفو کی امید سے منہ پھیر لینا نئی بات ہے ؎

تو بصد جرم ز مشتاق نمی رنجیدی چیست اکنوں کہ بیک عرض تمنا رنجی

جاں نثار تو نکردن چہ گناہ است عظیم نیست بیجا اگر از خضر و مسیحا رنجی

یار کے سامنے اِدھر اُدھر دیکھنا کمال بے ادبی سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے مُردے آنکھیں بند رکھتے ہیں اور کسی سے خبر نہیں ہوتے ؎

تو کہ ضبط نگہ خود نتوانی کردن منع رسوائی احباب چرا باید کرد

باعتبار جہاں اعتبار نیست مرا دماغ دشمنی روزگار نیست مرا

آپ ہم سے اپنا حساب مانگتے ہیں۔ ہمارا حال نہیں پوچھتے کہ ہم پہ خدا جانے کیا کیا گذر گئی ؎

بلسے نفسِ امّارہ آوارہ گشت　　نہ پرسی زِمن آنچہ بر من گزشت

عُرس و سالگرہ

اخبار والے جن کو سخن گستری کا شوق ہے۔ سال کے انجام و آغاز کے دو مضمون ذرا زور سے لکھتے ہیں۔ اتفاق سے مجھے اِن دِنوں دو مضمون علیحدہ علیحدہ لکھنے کی فرصت نہیں۔ ایک مضمون کی بچت نکال کر۔ سال کے انجام و آغاز کو میں عُرس و سالگرہ سے تشبیہ دیتا ہوں کہ ۳۱ دسمبر کو تو گویا پیرِ گردوں کا عُرس سمجھئے۔ اور یکم جنوری کو گردشِ روزگار کی سالگرہ۔

وجہ یہ ہے کہ صلائے عام کا یہ پرچہ دسمبر کے اخیر اور جنوری کے آغاز میں آپ کی نظر سے گزرے گا۔ اِس لئے اِس تقریب میں ایک ہی مضمون بس ہے ؎

ہے بہرِ عذرِ حسنِ ادائے بیاں ضرور   تم شب کو جانِ غیر کہیں میری زباں ہے آج

عالمِ اسباب میں آپ اجتماعِ ضدّین کا زیادہ اثر دیکھ رہے ہیں کہ ایک کا انجام دوسرے کا آغاز ہے۔ ایک کی موت دوسرے کی زندگی کا سبب ہے ع

اگر نیند آئی تو جاوے گی رات

پھل کا زمین پر گرنا پودے کی نشوونما کا باعث سمجھئے۔ اور پھول

کی پتّیوں کا جھڑنا پھل کے پیدا ہونے کا سامان ہے۔ بزرگوں کا عُرس تو بچّوں کی سال گرہ بھی چاہیے۔ دسمبر کی اخیر رات کو پیرِ گردوں کا عُرس منائیے تو پہلی جنوری کی صبح کو گردشِ روزگار کی سال گرہ ؎

زلفوں سے ہے نمودِ سحر شامِ وصل میں
جوڑا پکارتا ہے کہ پچھلا پہر ہوا

ہر سال کا اخیر میری نگاہ میں زمانہ کا عُرس ہے کہ جس طرح اولیائے اللہ کو کہتے ہیں کہ فنا نہیں۔ اُن کا ہماری نظر سے غائب ہونا "وصال" سمجھا جاتا ہے۔ اِسی طرح ایک سال کا غائب ہونا جزو کا کُل میں مِلجانا ہے۔ اِسے وصال نہیں تو اور کیا کہئے؟ ورنہ زمانہ وہی ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ گئے ہوئے زمانہ کو آپ فاتحہ خیر سے یاد کریں کہ حاصلِ عُرسِ بزرگاں یہی ہے اور گردشِ روزگار کی سال گرہ منائیں کہ دنیا کا مدار اسی پر ہے ؎

لو ابتدا سے ہم کہیں اب داستانِ عشق
آخر شبِ فراق کی تو انتہا نہیں

اتّفاقاتِ زمانے سے پیرِ گردوں کی سال گرہ کا دن یہی تھا جو گردشِ روزگار کی سال گرہ کا دن ہے کہ آغازِ عالم میں تمام کائنات ایک ہی وقت کُن فیکون سے پیدا ہوئی۔ پیرِ گردوں کی سالگرہ کی یادگار کہکشاں آسمان پر موجود ہے ؎

دوستانِ رفتہ کی روداد کس سے پوچھئے
بات کے لائق کوئی شہرِ خموشاں میں نہ تھا

سال گرہ دراصل کوئی عقدۂ لاینحل نہیں حسین وعدہ کی گرہیں خضر کے رشتۂ عمر سے زیادہ لگاتے ہیں مگر وفا کرنی بھول جاتے ہیں۔ شاعر موتی کی تشبیہ گرہ سے دیتے ہیں۔ گو قطرۂ اشک کی شکل گرہ سے زیادہ متشابہ ہے ؎

غفلت شریکِ حال تھی پہلے بھی حسن کے   یوسف کنوئیں میں دیدۂ یوسف میں خواب تھا

سال گرہ سے ماں باپ تو یوں خوش ہوتے ہیں کہ بچّے کی عمر ایک سال بڑھ گئی۔ مگر سمجھنے والے جانتے ہیں کہ روزِ ازل سے جو عمر کاتبِ تقدیر نے لکھ دی اُس میں ایک سال گھٹ گیا۔ چوبے جی دُوبے رہ گئے۔ سال گرہ میں کچھ گرہ ہی سے کھو یا گیا ؎

نہیں یاں جز غبارِ نیستی کچھ   یہی خاک اُڑ رہی ہے آسماں تک

لیکن دنیا میں شادی و غمی۔ رنج و راحت۔ تکلیف و آرام توام ہے گویا اجتماعِ ضدّین کا مجموعہ ہے بارِ غم میں ہم زمین کی طرف سر جھکائے ہوئے ہیں تو صبر و استقلال میں آسمان کی طرف نگاہ ہے۔ زمین نہیں تو آسمان کا وجود بھی نہ سمجھئے۔ اور آسمان ہے تو زمین کہاں نہیں ؟ زمین کو آسمان سے مفر نہیں۔ نہ آسمان کو زمین سے مفر ہے۔ یوں کہنے کو زمین و آسمان میں "آسمان و زمین" کا فرق ہو تو ہوا کرے ؎

آجتک پایا عروسِ مرگ کا جوڑا اسپید   رنگ شاید لے فلک خونِ شہیداں میں نہ تھا

ہم اِس جہان کو سرائے فانی کہتے ہیں۔ مگر چتوڑ کے سے قلعے اور قطب صاحب کی لاٹ جیسے مینار۔ الحمرا سے مکان اور اہرام مصری سی عمارتیں جو قیامت کی خبر لائیں۔ انسانوں ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ زندگی کو نفسِ چند سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے۔ ہمیں اپنی زندگی کا یقین نہیں مگر محض نام پر مٹے ہوئے ہیں کہ قیامت تک نہ مٹے۔ دنیا کا اعتبار نہیں سمجھتے مگر رات دن اسی کی تلاش میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ فلکِ پیر کی شعبدہ بازیوں کے شاکی ہیں مگر مصیبت میں آسمان ہی کی طرف نگاہ جاتی ہے +

آپ نے دیکھا ہوگا کہ چراغ ہوا میں بجھ جاتا ہے۔ مگر ہوا بالکل رُک جائے تو بھی جل نہیں سکتا۔ پھول دھوپ میں کُملا جاتے ہیں مگر بالکل سایہ ہی میں رکھیے تو مرجھائے بغیر نہیں رہتے +

یہ اجتماعِ ضدّین نہیں تو کیا ہے؟ زندگی نام اجتماعِ ضدّین کا ہے۔ اِس میں رونا اور ہنسنا دونوں ضرور ہیں۔ شبنم کا رونا تو گلوں کا ہنسنا اِس باغ کی رونق کا سبب ہے ؂

بلبلوں کے حق میں اب صیّاد کانٹے بوتے ہیں   یاد ایا میکہ اک پتّہ گلستاں میں نہ تھا

عالم اسباب کتنا ہی ناپائدار رہے تو ہوتے دیکھیے۔ اِس سے بیزار رہنا

غلطی ہے۔ اس کا لطف ہی اس کی ناپائداری میں ہے۔ دریا کی خوبی روانی میں ہے۔ اور زمانہ کا انحصار گردش پر ہے۔ بوئے گل اگر دیرپا نہیں تو نسیم سحر کا کیا قصور؟ اور باغ میں خزاں کا گزر ہے تو بہار اپنا آنا کیوں ترک کرے؟ یہی زرد پتیاں جو خزاں میں گرتی ہیں۔ بہار میں رنگ لاتی ہیں۔ اور آندھیاں جو گرمیوں میں چلتی ہیں۔ برسات میں ابر و باراں پیدا ہونے کا سبب ہو جاتی ہیں +

اس عالم کی بے ثباتی ہی پر بقائے عالم کا مدار سمجھئے۔ دنیا ایک ہی حالت پر رہتی تو کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔ یہ سال و ماہ اسے دیکھنے نصیب نہ ہوتے + بقائے دوجہاں صرف ایک چیز پر موقوف ہے جسے فنا کہتے ہیں۔ اور زندگی کی قدر انہیں کی نگاہ میں ہے جن کو فنا ہونا پسند ہے ۔

بحرِ جہاں میں اہلِ ہوس کو نہ تھا ثبات　　جس کی ہوا بندھی ہوئی تھی وہ حباب تھا
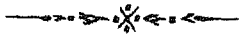
انگریزی میں کسی شاعر کا مضمون ہے کہ حُسن اس لئے دلفریب ہے کہ ہماری ہستی کی طرح بے ثبات ہے۔ اور علم کی قدر ہماری نگاہ میں اسلئے ہے کہ اس میں کمال مشکل ہے + مرنے کے بعد کسی چیز کو کمال حاصل ہو تو ہو۔ عالمِ اسباب میں کمال کی قدر نقص سے ہے اور ہنر کی قدر عیب سے ۔ بیداری کی قدر غفلت سے اور زندگی کی قدر موت سے +

بچے جن کھلونوں پر جان دیتے ہیں جوان انہیں پھینک دیتے ہیں۔
اور جوانوں کو جو باتیں عزیز ہیں بوڑھے انہیں فضول سمجھتے ہیں ٭
لیکن مجھ سے پوچھئے تو اس عالم کی مختصر سے مختصر زندگی مرنے کے بعد
قیامت تک زندہ رہنے سے کہیں اچھی ہے اور اس دارِ فانی کی اُلجھن
عالمِ بقا کے وعدوں سے جن کے پورا ہونے کا حال معلوم نہیں
(آگے کیا عرض کروں؟) ؎

چھوٹی سے چھوٹی رات بھی اچھی ہے وصل کی
چھوٹے سے چھوٹا دن بھی ہے اچھا بہار کا ٭
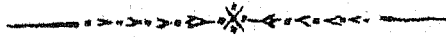
حصۂ دوم نظم

مرزا محمد رفیع۔ سوداؔ

مرزا محمد رفیع کے والد مرزا محمد شفیع میرزایانِ کابُل سے تھے بزرگوں کا پیشہ سپاہ گری تھا۔ مرزا شفیع بطریقِ تجارت وارد ہندوستان ہوئے۔ ہند کی خاکِ دامنگیر نے ایسے قدم پکڑے کہ یہیں کے ہو رہے۔ سوداؔ ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور دہلی میں تربیت اور نشوونما پائی۔ بموجب رسم زمانہ کے اوّل سلیمان قلی خان ودادؔ کے پھر شاہ حاتمؔ کے شاگرد ہوئے۔ خانِ آرزوؔ کی صحبت سے بھی مستفید ہوئے۔ بلکہ اُنہیں کے اشارہ سے بجائے فارسی کے زبانِ اُردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دہلی ایسے شہر میں اِن کی اُستادی کو خاص و عام نے مان لیا۔ اِن کے سامنے ہی اِن کی غزلوں کا چرچا گھر گھر ہونے لگا۔ یہاں تک کہ شاہِ عالم بادشاہ اپنا کلام اِصلاح کے لئے دینے لگے۔ جب اِن کے کلام کا شہرہ نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ میں سُنا تو کمال اشتیاق اور عزّت کے ساتھ لکھنؤ بُلایا۔ اِنہیں دِلّی

چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ جواب میں فقط اِس رُباعی پر معذرت کو ختم کیا۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک | آوارہ ازیں کوچہ باں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے | بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

آخر جب دہلی میں قدر دان لوگ باقی نہ رہے گردشِ زمانہ سے مجبور ہو کر لکھنؤ کا قصد کیا۔ راستے میں چند روز فرخ آباد میں نواب بنگش کے پاس رہے۔ اس کی تعریف میں کئی قصیدے بھی لکھے۔ وہاں سے ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہونچے۔ نواب شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی۔ وہ بہت اعزاز سے ملے۔ اور اُن کے آنے پر مسرت ظاہر کی۔ لیکن بے تکلفی یا طنز سے اتنا کہا کہ مرزا وہ رُباعی تمہاری ابتک میرے دل پر نقش ہے۔ اور اُس کو مکرّر پڑھا۔ انہیں اپنے حال پر بڑا رنج ہوا اور بپاس وضعداری پھر دربار نہ گئے۔ یہاں تک کہ شجاع الدولہ مرگئے اور نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے۔ اُنھوں نے انعام و اکرام کے علاوہ چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور نہایت شفقت فرمانے لگے۔ جب تک مرزا زندہ رہے نواب صاحب مرحوم اور اہلِ لکھنؤ کی قدردانی سے ہر طرح فارغ البال رہے۔ تقریباً ستر برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں دنیا سے انتقال کیا۔ آپ کا کلام سرتاپا نظم اور انشاءِ اُردو کا دستور العمل ہے۔ غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رُباعی۔ قطعات۔ مخمس۔ مستزاد۔ ترجیع بند۔

واسوخت سب کچھ لکھا ہے۔ ہر قسم کی نظم میں ہجویں ہیں جو مخالفوں کے دل وجگر کو خون اور کباب کرتی ہیں۔ غزلیں اِن سے پہلے بھی لوگ اُردو میں کہتے تھے مگر مدح میں شعرا نے ابتک جو کچھ کہا تھا۔ وہ ایسا ہے کہ اُسے قصیدہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اوّل قصائد کا کہنا پھر اِس دھوم دھام سے اعلیٰ درجۂ فصاحت وبلاغت پر پہونچانا اِن کا پہلا فخر ہے۔ وہ اِس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عنان درعنان ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں۔ اِن کے کلام کا زور شور انوری اور خاقانی کو دباتا ہے اور نزاکتِ مضمون میں عرفی اور ظہوری کو شرماتا ہے۔ مثنویاں البتہ اس پایہ کی نہیں ہیں۔ گرمیِ کلام کے ساتھ ظرافت جو ان کی زبان سے ٹپکتی ہے۔ اُس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑھاپے تک شوخیِ طفلانہ ان کے مزاج میں اُمنگ دکھاتی تھی۔

ہجوؤں کا مجموعہ جو کلیات میں ہے اُس کا ورق ورق ہنسنے والوں کے لئے زعفران زارِ کشمیر کی کیاریاں ہیں ذرا ناراضی میں بے اختیار ہو جاتے تھے کچھ اور بس نہ چلتا تھا جھٹ ایک ہجو کا طومار تیار کر دیتے تھے۔ عالم۔ جاہل۔ فقیر۔ امیر۔ نیک۔ بد کسی کی ڈاڑھی ان کے ہاتھ سے نہیں بچی۔ اِس طرح پیچھے پڑتے تھے کہ انسان

جان سے بیزار ہو جاتا تھا۔

کُل اہلِ سخن کا اتفاق ہے کہ مرزا فنِ شعر و سخن میں اُستادِ مسلم الثبوت تھے جن اشخاص کی زبان نے اُردو کو پاک صاف کیا ہے مرزا کا اُن میں پہلا نمبر ہے۔ اُنھوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایک کیا ہے ہندی زبان کو فارسی محاوروں سے نہایت زور بخشا ہے۔ اِنہی کا زورِ طبع تھا جس کی نزاکت سے دو زبانیں ترکیب پا کر تیسری زبان پیدا ہو گئی۔ اور اُسے ایسی قبولیتِ عام حاصل ہوئی کہ آیندہ کے لئے وہی ہندوستان کی زبان ٹھیری۔ جس نے حکّام کے درباروں اور علوم کے خزانوں پر قبضہ کیا۔
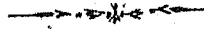
مخمّس شہر آشوب

مرزا سودا کا زمانہ دلّی کی سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا جب کہ ہندوستان کے ہر صوبے میں خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں اور اکبر اور عالمگیر کے جانشینوں کی وقعت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ اس نظم میں اسی تباہی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ بقول حضرت آزاد "غور سے دیکھو تو ملک کی دل سوزی نے اپنے وطن کا مرثیہ کہا ہے"۔

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول
پھرے ہے۔ جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول
جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند
سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدّت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس[1] صوبے کا خاوند
رہی نہ اُس کے تصرّف میں فوجداری کول[2]

[1] سلطنت مغلیہ کے زمانۂ عروج میں اس کے بائیس صوبے تھے ... [illegible]

امیر اب جو ہیں دانا انہوں کی ہے یہ چال
ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کا حال
بچھی ہے سوزنی خوجا کھڑا اچھلے ہے رومال
حضور بیٹھے ہیں ایک دو ندیم اہلِ کمال
دھری ہے روبرو اک پیکدان و اک تنبول
نہ صرف خاص ہیں آمد نہ خالصہ جاری
سپاہی تا منصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفترِ تن کی میں کیا کہوں خواری
سوالِ دستخطی کو پھاڑ کر کے پنساری
کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹول
کرے ہے بھوک سے شاگرد پیشہ اب یہ معاش
کہیں پلاؤ تو باورچی واں پکاوے آش
کریں قناتوں میں دربان بیٹھے پردہ فاش
تلے سے کھینچ لے مسند کو آن کر فراش
اگر کہیں کہ میاں اٹھ کے چاندنی کا جھول
غرض مآل ہے اِس گفتگو سے یہ میرا
کہ جیسے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا

کچہری میں

دو انگا ماس

تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا
نہیں پہ فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا
کرے نہ عزم سوئے اصفہان استنبول

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز
تو اس کو سن کے کریں ہوش چند کے پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہرِ نماز
تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغ غول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہے تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم
نہ جانے کن نے رکھا یاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو صنوبر وہاں اُگے ہے زقوم
مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھی کلول

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں اٹھا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول
بس اب خموش ہو سودا کہ آگے تاب نہیں
وہ دل نہیں کہ اب اس غم سے جو کباب نہیں
کسی کی چشم نہ ہوگی کہ وہ پُر آب نہیں
سوائے اس کے تری بات کا جواب نہیں
کہ یہ زمانہ ہے اس طرح کا زیادہ نہ بول

قصیدہ

حافظ رحمت خاں کی شکست اور نواب شجاع الدولہ بہادر کی فتح کے بیان میں

۱۷۷۲ء میں جبکہ مرہٹے روہیلکھنڈ پر حملہ کرنے والے تھے تو نواب شجاع الدولہ نے رُوہیلوں کی مدد کی تھی اور اس مدد کے معاوضہ میں رُوہیلوں نے اِن کو چالیس لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر اِس وعدہ کا ایفا نہیں ہوا۔ ۱۷۷۴ء میں نواب شجاع الدولہ اور روہیلوں کے سردار حافظ رحمت خاں سے لڑائی ہوئی اِس لڑائی میں انگریزی فوج نواب شجاع الدولہ کی مددگار تھی۔ روہیلوں کو شکست ہوئی اور حافظ رحمت خاں لڑائی میں مارے گئے۔

آیا عمل میں تیغ سے تیری یہ کارزار — دیکھا جسے نہ تُرکِ فلک نے بہ روزگار

بے سر ہوئے ہیں آج یہ سرکش کہ گر نہال — خاک اُن کی پہ اُگے نہ ثمر لائے شاخسار

سرِ جنگ اِس طرح کی نہ دکھائی کہ تا بہ حشر — مدفون ہوں جس زمیں پہ تو واں اُٹھ سکے غبار

آتش غضب کی تو نے یہ ان کے فسردہ کی
تن میں نہیں ہے قطرۂ خوں صورت شرار

نام اُن کا تیری تیغ نے معدوم یہ کیا
سے نعف کرے ہے سگ ہی نہ غارِ زاغ کو مسار

ایک خم تھا دل اُنہوں کا پُر از بادۂ غرور
تیں اُس میں کر دیا نمک تیغ آبدار

تھا عزم یہ ہر ایک کا گاویں گے بیٹھ ہم
تیغوں کو کھینچ کھینچ کے قلقاری مار مار

آئے تھے وہ چنانچہ اِسی طرح روزِ جنگ
پایا تھا جو دلوں میں خیال اُن کے نے قرار

گاتے بجاتے ناچتے اور کودتے ہوئے
سایہ میں جھنڈیوں کے صفیں باندھ بیشمار

وہ جھنڈیاں نظر پڑیں ایکدم میں اِسطرح
گاذر بچھاویں پارچہ جوں نہر کے کنار

پر حق بجانب اُن کے ہی تھا کچھ اِس امر میں
تیرے دلاوروں کا نہ دیکھا تھا کارزار

جو غول تیرے سامنے آیا تو سمجھے یہ
ایک کھیت روبرو ہے ہمارے پُر از خیار

جیسی ہی اُس گروہ نے پی تھی شرابِ کبر
کھینچا ہے اُسکے نشے سے ویسا ہی کچھ خمار

اسباب پر حریف کے آپس میں لگتے داؤں
لشکر میں اپنے بیٹھ کے جب کھیلتے قمار

حق ناشناس قوم یہ تھی غرّہ اِس قدر
غارت پہ ہر نبرد کے لیتی تھی سب اُدھار

لیکن خدا کے فضل سے یہاں تا گرفتہ فرض
جو لائے تھے سو دے گئے رکھا نہ ایک تار

شمشیر و دست و بازو کے ہیں یہ بہت بلی
اپنا تو حرفِ حق سے گذرنا نہیں شعار

پر وہ جو ہیں غلامِ غلام اُس جناب کے
آگے قدم اُنہوں کے نہیں اُن کا استوار

جرأت میں اُن کے حرف نہیں پر یہ کیا کریں
صحبت نہ دل سے اُنکے تہور سے کی برار

اُن میں سے اِس غلام کے تھے اکثر آشنا
ہیں سے کہا اُنہوں سے کہ تم جیسے سرگذار

یک قوم و یک برادری و یک گروہ کے ہو سامنے حریف کے بے حد و بے شمار

حافظ کی لاش ڈال گئے معرکہ میں تم فتح و شکست مردوں کو ہے پر یہ اضطرار

اُن میں سے ایک نے بہ دمِ سرد یہ کہا خواہش خدا کی یوں تھی نہ تھا اپنا اختیار

لیکن جو کچھ کہ واقعی دیکھا سو ہم کہیں آوے تجھے سخن کا ہمارے گر اعتبار

تھی سامنے ہمارے جو فوجِ ہراولی ہونگے وہ دس ہزار تلک[51] پیادہ و سوار

سُنتے ہیں اب ہر ایک سے اُس فوج کے یہی سر کردہ تھے سمیت فرنگی کے پانچ چار

محبوب[52] اور بسنت و لطافت تھے یکطرف یک سو تھا میر سیّد علی مستعدِ کار

لیکن اُنھوں کو آدمی کہئے کہ دیو و دد ان کا قدم وغا میں یہ پایا ہم استوار

اِیدھر سے بان[53] و رہکلہ[54] و توپ متصل پڑتی تھی پر وہ بڑھتے ہی آتے تھے سر گذار

بڑھ بڑھ کے آخرش وہ لگے توپیں داغنے اُس پلہ پر جہاں سے جزائر[55] کی ہووے مار

لیکن میں تجھ سے کیا کہوں اے یار اُس گھڑی دکھلائی تھی اجل نے عجب طرح کی بہار

تھیں کُرتیاں تلنگوں کی مانند لالہ زار تھا دُودِ توپ ابرِ سیاہ تگرگ[56] بار

توپیں جو داغتے تھے فتیلوں سے آن آن رنجک[57] مثالِ برق چمکتی تھی بار بار

---

[51] اس لڑائی میں انگریزی فوج نواب شجاع الدولہ کی مدد پر تھی۔ [52] نواب کی فوج کے سرداروں کے نام۔ [53] ایک قسم کی ہوائی جو اگلے زمانہ کی لڑائیوں میں دشمن پر چھوڑا کرتے تھے۔ [54] چھوٹی توپ [55] ایک قسم کی بندوق۔ [56] ژالہ۔ [57] وہ بارود جو پُرانی وضع کی بندوق یا توپ کے پیالہ میں آگ دینے کے واسطے رکھی جاتی تھی۔

گج نال[1] مثلِ رعد کڑکتی تھی دم بدم
آوازِ شتر نال[2] تھی طاؤس کی چنگھار

بارود گولہ توپ میں تھا یا وہ باد تھی
جس نے کہ قومِ عاد[3] اُڑائی تھی جوں غبار

فرصت کسو نے اتنی نہ پائی کہ وہ کرے
بندوق و تیر تیغ سے جا اُن میں کارزار

ہر ایک جا یہی نظر آیا ہر ایک کو
گھوڑا اِدھر جو تڑپے ہے اُودھر پڑا سوار

اُڑتے تھے یوں پیادے کہ تودے کو روئی کے
نداف کا کمانچہ کرے ہے گا اِنتشار

تھے ہاتھیوں پہ بیٹھے جو حافظ کے ہمنشیں
ساتھ اُس کے ہم پیالہ و با ہم نوالہ خوار

وہ بھاگے اِس طرح کہ یہ کہتی تھی اُنکو خلق
بھاگا گا وہ دیکھو جائے ہے میداں سے کوہسار

نے لڑنے کے حواس تھے نے بھاگنے کا ہوش
نے سوچ مرنے کا ہی نہ جینے کا کچھ بچار

باور ہی کیجو اس کو تو اے یار اس گھڑی
آیا جو کچھ عمل میں نہ تھا اُس میں اختیار

جیدھر کو جس کا مُنہ اُٹھا اُودھر کو وہ چلا
سوچے بغیر یہ کہ کہاں جا کروں قرار

ہو یہ غضب تو لاش کا حافظ کی ذکر کیا
بیٹا سسکتے چھوڑ کیا باپ نے فرار

حافظ کی لاش ہم سے نہ اُٹھی تو نزدِ فہم
جا گہہ نہیں ہے طعن و تعرّض کی ہم پہ یار

لازم نہ تھا اُسے کہ ہو ایسے کے سامنے
ہمت میں اور کرم میں جو ہے طاقِ روزگار

لے زر سے تا جواہر و از اسپ تا بہ فیل
جس کے ہمم کے آگے نہ رکھتے کچھ اعتبار

نہ رُتبہ زر کو ہے نہ جواہر کو منزلت
نہ قدر اسپ کی ہے نہ کچھ فیل کا وقار

[1] ایک قسم کی بڑی توپ۔ [2] ایک قسم کی چھوٹی توپ جو اُونٹ پر لادی جاتی تھی [3] ایک قوم جو خدائے تعالیٰ کی نافرمانی کے باعث طوفانِ باد سے برباد ہوئی۔

خلعت کسی کو اسپ کسی کو کسی کو فیل | بخشے کسی کو لاکھ کسی کو دے ہزار
حافظ یہ چاہے عہدہ[۱] سے اسکے برآؤں میں | پیادہ کو دے کے تین روپے نو روپیہ سوار
کہتے تھے اُسکو حافظِ زر دوست خلق میں | رکھتا تھا نا دہندی میں ایسا وہ اشتہار
کیا کیا کروں میں اُسکی شجاعت کا اب بیاں | ہمت کا اُسکی کیا کروں اظہار بار بار
حافظ نے سر دیا نہ دیا زر[۲] ہوئی ہے یہ | تاریخ اُس کی فوت کی کر لے عدد شمار

تاریخِ فتح عرض کی سوداؔ نے یوں کہ ہو
یہ فتحِ نو مبارک نوابِ نامدار

[۱] عہدہ برآ ہونا۔ بری الذمہ ہونا۔ چھٹکارا پانا۔

[۲] حافظ کا سر یعنے ح نکال کر "افظ" کے اعداد میں "زر" کے عدد جوڑنے سے ۱۱۸۸ حاصل ہوتے ہیں۔

میر تقی میر

نام نامی آپ کا محمد تقی ہے۔ میر تخلص کرتے تھے۔ آگرہ کے ایک شریف گھرانے میں ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے باپ کے انتقال کے بعد دہلی کا قصد کیا۔ اور خان آرزو سے جو زبانِ فارسی کے مسلم الثبوت محقق تھے شعر و سخن کی مشق شروع کی اور اِس فن میں وہ کمال حاصل کیا کہ اساتذہ ان کے کلام کو زبانِ اُردو کے لئے سرمایۂ ناز سمجھتے ہیں۔ مرزا نوشہ فرماتے ہیں ۔

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

ہندوستان میں یہ بات اِنہیں کو نصیب ہوئی ہے۔ کہ مسافر غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر بہ شہر لے جاتے تھے۔ اگرچہ دلّی میں شاہِ عالم کا دربار اور اُمرا و شرفا کی محفلوں میں ادب ہر وقت ان کے لئے جگہ خالی کرتا تھا۔ اور ان کے جوہرِ کمال اور نیکیِ اَطوار و اعمال کے سبب سے سب عظمت کرتے تھے مگر خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے اور وہاں تو خود خزانۂ سلطنت خالی تھا اِس لئے ۱۱۹۰ ہجری میں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کا قصد کیا۔ اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ نواب آصف الدولہ نے دو سو روپیہ مہینہ کر دیا۔ میر صاحب کی نازک مزاجی اور بد دماغی ہمیشہ ان کے ساتھ رہی کسی بات پر

نواب صاحب سے ناخوش ہو گئے اور دربار جانا بند کر دیا۔ بدستور خانہ نشینی
اختیار کی اور فقر و فاقہ میں گذارہ کرتے رہے۔ آخر ۱۲۲۵ھ ہجری میں سو برس
کی عمر پا کر بمقام لکھنؤ رحلت فرمائی۔ ناسخ نے تاریخ کہی۔

واویلا مرد شہ شاعراں

میر صاحب نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل سے
طبیعت کو زیادہ مناسبت تھی چنانچہ اِس صنف میں ان کے کئی دیوان
ہیں۔ چونکہ مطالب کی دقت۔ مضامین کی بلند پروازی الفاظ کی شان
و شوکت۔ بندش کی چستی لازمہ قصائد کا ہے۔ وہ طبیعت کی شگفتگی اور
جوش و خروش کا ثمر ہوتا ہے۔ اسی واسطے میر صاحب کے قصیدے
غزلیات کے مقابلہ میں جس قدر تعداد میں کم ہیں اُسی قدر درجہ میں بھی
گھٹے ہوئے ہیں۔ میر صاحب نے زبان اور خیالات میں جس قدر صفائی
پیدا کی ہے۔ اُتنا ہی بلاغت کو کم کیا ہے۔ اِن کا صاف اور سُلجھا ہوا کلام
اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے۔ اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت
بخشتا ہے۔ اِن کی زبان شُستہ کلام صاف۔ بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں
کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں
ادا کر دیتے ہیں۔ اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں
ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اِسی واسطے اِن میں پہ نسبت اور شعرا کے

اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے۔ بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں میر صاحب کو شگفتگی یا بہارِ عیش و نشاط یا کامیابی وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا۔ وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے اُسی کا دُکھڑا سناتے چلے گئے۔ جو آج تک دلوں میں اثر اور سینوں میں درد پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے مضامین اور شعرا کے لئے خیالی تھے اِن کے حالی تھے ◆
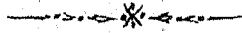
غزلوں کا انتخاب

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

قطعہ

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یہاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے تو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا
دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا
جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا
صبح گذری شام ہونے آئی میر
تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
فیض اے ابر چشم تر سے اٹھا
آج دامن وسیع ہے اس کا
تاب کس کو جو حال میر سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

جا کے پوچھا جو میں یہ کارگہ مینا میں
دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ
کہنے لاگے کہ کدھر پھرتا ہے بہکا اے مست
ہر طرح کا جو تو دیکھے ہے کہ یاں ہے شیشہ
دل ہی سارے تھے یہ اک وقت میں جو کر کے گداز
شکل شیشہ کی بنائی ہے کہاں ہے شیشہ

بات کیا آدمی کی بن آئی
آسماں سے زمین نپوائی
چرخ زن اسکے واسطے ہے مدام
ہو گیا دن تمام رات آئی

ماہ و خورشید ابر و باد سبھی — اِس کے خاطر ہوئے ہیں سودائی

کیسے کیسے کیے تردد جب — رنگ رنگ اِس کو چیز پہنچائی

اِس کو ترجیح سب کے اوپر دی — لطفِ حق نے کی عزت افزائی

حیرت آتی ہے اس کی باتیں دیکھ — خودسری خودستائی خودرائی

شکر کے سجدوں میں یہ واجب تھا — یہ بھی کرتا سدا جبیں سائی

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

جھُٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں — تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز — میرؔ اِس کو رائگاں کھوتا ہے کیا

نوٹ - نپٹ - اِتنے - کہنے لاگے وغیرہ اب متروک ہیں - سودا - میر - اور میر امن وغیرہ کی تصانیف میں اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ بعض الفاظ اور محاورے جن کو یہ بزرگ بلا تکلف استعمال کرتے تھے اب ترک کر دیے گئے ہیں -

خواجہ حیدر علی - آتش

اِن کے باپ خواجہ زادوں کے خاندان سے تھے جس میں مسندِ فقر بھی قائم تھی اور سلسلہ پیری مُریدی کا بھی تھا۔ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ سپاہیانہ۔ رندانہ۔ اور آزادانہ وضع رکھتے تھے۔ مصحفی کے شاگرد اور ناسخ کے ہمعصر تھے۔ اِن کی آتش بیانی نے اُستاد کے نام کو روشن کیا بلکہ کلام کی گرمی اور چمک دمک نے اُستاد اور شاگرد کے کلام میں اندھیرے اُجالے کا امتیاز دکھا دیا۔ اپنے زمانہ میں مسلم الثبوت اُستاد مانے گئے اور سیکڑوں شاگرد دامنِ تربیت میں پرورش پاکر اُستاد کہلائے۔ آتش نے اہلِ دول کی مدح میں نہ کبھی قصائد لکھے نہ اُمرا کے درباروں میں جاکر غزلیں سنائیں۔ اسّی روپیہ شاہِ اودھ کی سرکار سے پاتے تھے اُسی پر قناعت کرتے تھے۔ عمرِ چندروزہ کو اِس طرح گذار دیا جیسے کوئی بے نیاز اور بے پروا فقیر تکیہ میں بیٹھا ہوتا ہے۔ سنہ ۱۲۶۳ ہجری میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے یکایک موت کا ایسا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا تھا۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ لکھی۔

ع خواجہ حیدر علی اے وا مُرد

خواجہ آتش نے غزل کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ تمام عمر کی کمائی جسے حیاتِ جاوداں کا مول کہنا چاہیئے ایک دیوان غزلوں کا ہے جو اُن کے سامنے رائج ہو گیا تھا۔ دوسرا تتمّہ ہے جو بعد کو مرتب ہُوا۔

جو کلام اِن کا ہے حقیقت میں محاورۂ اُردو کا دستور العمل ہے اور انشا پردازی ہند کا اعلےٰ نمونہ۔ شرفائے لکھنؤ کی بول چال اِس سے معلوم ہوتی ہے جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اُسی طرح اُنہوں نے شعر کہدیئے ہیں۔ اِن کے کلام نے پسندِ خاص اور قبولِ عام کی سند حاصل کی۔ اِن کا کلام اہلِ سخن کے جلسوں میں پڑھا جاتا ہے اور عاشقانہ غزلیں موسیقی کی تاثیر کو چمکا کر محفلوں کو گرماتی ہیں۔

ناسخ اور آتش میں کبھی شاعرانہ نوک جھوک ہو جاتی تھی۔ کوئی مخاصمت اور عناد نہ تھا۔ جب شیخ ناسخ کا انتقال ہوا تو خواجہ صاحب نے تاریخ کہی اور اُس دن سے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ کہ جب سخن فہم نہیں تو سخن بھی نہیں۔ آتش کا کلام مضامینِ بلند سے خالی نہیں ہاں طرزِ بیان صاف ہے سیدھی سی بات کو پیچ نہیں دیتے ہیں۔ ترکیبوں میں استعارے اور تشبیہیں فارسیت کی بھی موجود ہیں۔ مگر قریب الفہم۔ ساتھ اس کے اپنے محاورہ کے زیادہ پابند ہیں۔ یہ درحقیقت ایک وصفِ خداداد ہے۔ کلام کو رنگینی اور استعارۂ تشبیہ سے بلند کر دکھانا آسان ہے۔ مگر زبان اور روزمرہ کے محاورہ میں صاف صاف مطلب اِس طرح ادا کرنا جس سے سُننے والے کے دل پر اثر ہو یہ بات مشکل ہے۔

غزلوں کا انتخاب

حبابِ آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اِس قطرے کو دریا کی جدائی کا

تعلق روح سے مجھ کو جسد کا ناگوارا ہے
زمانہ میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

ہوئی منظور محتاجی نہ تجھکو اپنے سائل کی
بنایا کاسۂ سر واژگوں کاسہ گدائی کا

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھکو
کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

شکستِ خاطرِ احباب ہوتی ہے درست اس سے
توجہ میں تری اے یار اثر ہے مومیائی کا

حسنِ پری ایک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا

گریاں ہے اگر شمع تو سر دُھنتا ہے شعلہ
معلوم ہوا سوختہ پروانہ ہے اُس کا

وہ شوخ نہاں گنج کے مانند ہے اِس میں
معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اُس کا

جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اُس کی
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُس کا

دل قصرِ شہنشہ ہے وہ شوخ اُس میں شہنشاہ
عرصہ یہ دو عالم کا جلوخانہ ہے اُس کا

وہ یاد ہے اُس کی کہ بھلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اُس کا

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اُس کا

آوارگیِ نکہتِ گُل سے ہے اشارہ — جامے سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اُس کا
یہ حال ہوا اُس کے فقیروں سے ہویدا — آلودۂ دُنیا جو ہے بیگانہ ہے اُس کا
شکر اللہ ساقیِ ازل کرتا ہے آتش — لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

برنگِ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں — تو اُس نے منزلِ مقصود کو زیرِ قدم پایا
ہزاروں حسرتیں جائیں گی میرے ساتھ دنیا سے — شرار و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا
سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں — غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا
نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں — صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا

عاجز نواز دوسرا تجھ سا نہیں کوئی — رنجور کا انیس ہے ہمدم علیل کا
باغ و بہار آتشِ نمرود کو کیا — مشکل کے وقت حامی ہوا تُو خلیل کا
موسیٰ کو تیرے حکم سے دریا نے راہ دی — فرعون کو تُو نے غرق کیا رودِ نیل کا
طوفاں میں ناخدائی کی کشتیِ نوح کی — حقا جواب ہی نہیں تجھ سے کفیل کا
آتش یہی دعا ہے خدائے کریم سے — محتاج اے کریم نہ کیجو بخیل کا

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا
زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف — قاروں نے راستے میں لُٹایا خزانہ کیا

اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

طبل و علم ہے پاس نہ اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا

ہوتا ہے زرد سُن کے جو نامرد مدعی
رستم کی داستان ہے اپنا فسانہ کیا

دکھایا آئینہ فکر نے جب صفائے آبِ دُرِ سخن کا
دہن کو جوہر کھلا زباں کا زباں کو عقدہ کھلا دہن کا

برہنہ آیا تھا یاں عدم سے برہنہ یاں سے چلا عدم کو
نہ بوئے کافور میں نے سونگھی نہ داغ مجھ کو لگا کفن کا

خراب مٹی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مردود دوستاں ہو
جُدا ہوا شاخ سے جو پتا غبارِ خاطر ہوا چمن کا

شرف بخشا گہر کو صرف کر کے تو نے زیور میں
نگیں کو نام نے تیرے بٹھایا خانۂ زر میں

یہ کیفیت اسے ملتی ہے جو جس کے مقدر میں
مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں

رہا کرتا ہے نظمِ شعر کا سودا مرے سر میں
عروسِ فکر ان روزوں لدی رہتی ہے زیور میں

جہاں چاہے بسر اوقات کر لے چار دن بلبل
چمن میں آشیانہ ہے قفس صیاد کے گھر میں

نہ جبتک ہم پیالہ ہو میں ہر گز نہیں پیتا
مآلِ کار کی صورت بھی آنکھوں کو نظر آتی
نکل کر کنجِ عزلت سے نہ کر ہنگامہ افروزی

نہیں مہماں تو فاقہ ہے خلیل اللہ کے گھر میں
لگا دیتا تھا اک آئینہ بھی قبرِ سکندر میں
شرر یاقوت کا ہم سنگ ہے جبتک ہے پتھر میں

نشۂ دولت سے منعم پیرہن میں مست ہے
مردِ مفلس حالتِ رنج و محن میں مست ہے
دورِ گردوں ہے خداوندا کہ یہ دورِ شراب
دیکھتا ہوں جس کو میں اس انجمن میں مست ہے

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
خدا پنہاں ہے عالم آشکارا
دلِ روشن ہے روشنگر کی منزل
شگفتن سے بری ہے حسنِ ذاتی
شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ

زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے
نہاں ہے گنج ویرانہ عیاں ہے
یہ آئینہ سکندر کا مکاں ہے
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے
قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
طلبِ دنیا کو کر کے زن مریدی ہو نہیں سکتی

گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب ہو انسان آتا ہے
خیالِ آبروئے ہمتِ مردانہ آتا ہے

تماشا گاہِ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو
کسے اس انجمن میں یاد خلوت خانہ آتا ہے

زیارت ہوگی کعبہ کی یہی تعبیر ہے اسکی
کئی شب سے ہمارے خواب میں بتخانہ آتا ہے

خدا کا گھر ہے بتخانہ ہمارا دل نہیں آتش
مقامِ آشنا ہے یاں نہیں بیگانہ آتا ہے

ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر نہ کوئی دیار راہ میں ہے

سمندِ عمر کو اللہ رے شوقِ آسائش
عناں گسستہ و بے اختیار راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق اپنے ساتھ
فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہونچ ہی جائینگے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

سرِ شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریئے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریئے

مقسوم کا جو ہے سو وہ پہونچے گا آپ سے
پھیلائیے نہ ہاتھ نہ دامن پساریئے

طالب کو اپنے رکھتی ہے دنیا ذلیل و خوار
زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک نیاریئے

تنہائی ہے غریبی ہے صحرا ہے خار ہے
کون آشنائے حال ہے کس کو پکاریئے

کام ہمت سے جوانمرد اگر لیتا ہے — سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انساں — زہر پی کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل — بادشہ تخت سے یاں اپنے اُتر لیتا ہے

عقل کردیتی ہے انساں کی جہالت زائل — موت سے جان چھپانے کو سپر لیتا ہے

غیرت نالہ و فریاد نہ کھوا سے آتش — آشنا کوئی نہیں کون خبر لیتا ہے

مرزا اسد اللہ خاں غالب

غزلوں کا انتخاب

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا — بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب — شرم تم کو مگر نہیں آتی

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی سو وہ بھی خموش ہے

قصیدہ

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا ہے دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص
حبذا اے نشاطِ عامِ عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام[1]
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے اُمید گاہِ انام[2]
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالب اُسکا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بطرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ — قُربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھکو کیا پایہ روشناسی کا — جُز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تُو — پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بَن ماہتاب بَن میں کون — مجھکو کیا بانٹ دیگا تو انعام
میرا اپنا جُدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص — گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھکو فرِ فروغ — کیا نہ دیگا مجھے مئے گلفام
جب کہ چودہ منازلِ فلکی — کر چکی قطع تیری تیزیِ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر — کوئے مشکوئے صحن منظرِ عام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز — اپنی صورت کا اک بلوریں جام

مطلعِ ثانی

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ — اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن — نامِ شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہرِ ذوالجلال والاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف — نو بہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول معنیِ الہام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم — رزم میں اوستادِ رستم و سام

چشمِ بد دور خسروانہ شکوہ — لوحش اللہ عارفانہ کلام

اے ترا لطفِ زندگی افزا — اے ترا عہدِ فرخی فرجام

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم — جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے — ایرج و تور و خسرو و بہرام[1]

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے — گیو و گودرز و بیژن و رہّام[2]

مرحبا موشگافیِ ناوک — ق — آفریں آبدارئِ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیرِ ہدف — تیغ کو تیرے تیغِ خصم نیام

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند؟ — ق — برق کو دے رہا ہے کیا الزام؟

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا — تیرے رخشِ سُبک عناں کا خرام

[1] ایران و توران کے مشہور بادشاہ

[2] ایران و توران کے مشہور پہلوان

~~~~~
~~~~~

آم کی تعریف

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز | کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا | شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے | نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے | خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے | ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں | آئے یہ گوئے اور یہ میدان
آم کے آگے پیش جاوے خاک | پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور | بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے | شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے | آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار | جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں | جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی | کوہکن باوجود غمگینی
جان دینے میں اس کو یکتا جان | پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر | کہ دوا خانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام | شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت[1] سے | باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بہ حکمِ رب الناس | بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مہر گلاس
یا خضر نے لگا کے شاخِ نبات | مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل | ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس | رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر ایک بار | پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہ[2] برگ و نوا[3] | نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہرو راہِ خلد کا توشہ | طوبیٰ[4] و سدرہ[5] کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم | ناز پروردہ بہار ہے آم

[1] مہربانی۔ [2] وہ جگہ جہاں چیزیں بنائی جاویں۔ [3] سازو سامان "کارگاہ برگ ونوا" = دنیا۔ [4] بہشت کا ایک درخت۔ [5] ایک درخت کا نام ہے جو ساتویں آسمان پر ہے اور جس کے آگے جبرئیل نہیں جا سکتے۔

شیخ محمد ابراہیم - ذوق

ذوق کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت سے باخبر تھے۔ ذوق ۱۲۰۴ھ ہجری میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ابتداً حافظ غلام رسول نام ایک شاہی حافظ کے مکتب میں بیٹھے۔ چونکہ حافظ صاحب کو خود مذاق شعر و سخن کا تھا ذوق کو بھی شوق پیدا ہوا۔ اور شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے۔ ایک بار مرزا رفیع السودا کی غزل پر غزل کہی اور اُستاد کے پاس لے گئے اُنھوں نے ناخوش ہو کر غزل پھینک دی کہ اُستاد کی غزل پر غزل لکھتے ہو۔ یہ خاموش ہو کر چلے گئے۔ اُس روز سے پھر شاہ صاحب کو غزل نہیں دکھائی اور بے اصلاح مشاعرہ میں پڑھنے لگے۔ رفتہ رفتہ کلام کی شہرت ہوئی۔ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سُننے والوں کے دلوں میں برقی اثر کی طرح دوڑنے لگی۔ دلّی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ شیخ صاحب نے ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ ہجری میں جمعرات کے دن وفات پائی مرنے سے تین گھنٹہ قبل یہ شعر کہا تھا۔ ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

اِس میں کلام نہیں کہ اُنھوں نے فکرِ سخن اور کثرتِ مشق میں فنافی الشعر کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ اور انشا پردازی کی روح کو شگفتہ کیا۔ غزل کے دیوان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر اِن کے کلام کا تازگیِ مضمون۔ صفائیِ کلام چُستیِ ترکیب۔ خوبیِ محاورہ اور عام فہمی ہے۔ مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ قصیدوں میں مرزا رفیع کا انداز ہے۔ چنانچہ وہی مشکل طرحیں۔ چُست بندشیں۔ برجستہ ترکیبیں۔ معانی کی بلندی۔ الفاظ کی شان و شوکت اِن کے ہاں بھی پائی جاتی ہے۔ کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اُتارے ہیں۔ مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے اُنھیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اُونچے نظر آتے ہیں۔

قصیدہ

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریرِ نغمہ جائے صریر

زباں سے ذکر اگر چھیڑئے تو پیدا ہو
نفس کے تار سے آواز خوشتر از بم و زیر

ہوا یہ باغِ جہاں میں شگفتگی کا جوش
کلیدِ قفلِ دلِ تنگ خاطرِ دلگیر

کرے ہے وا لبِ غنچہ در ہزار سخن
چمن میں موجِ تبسم سے کھول کر زنجیر

کچھ انبساطِ ہوائے چمن سے دور نہیں
جو وا ہو غنچۂ منقارِ بلبلِ تصویر

قفس میں بیضہ کے بھی شوقِ نغمہ سنجی سے
عجب نہیں کہ ہو مرغِ چمن بلند صفیر

اثر سے بادِ بہاری کے لہلہاتے ہیں
زمیں پہ ہمسرِ سنبل ہے موجِ نقشِ حصیر

نکل کے سنگ سے گر ہو شرارہ تخم فشاں
تو سبز فیضِ ہوا سے ہو وہ برنگِ شعیر

زمیں پہ گرتے ہی لے آئے دانہ برگ و ثمر
جو لوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحۂ تزویر

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیلِ مست بے زنجیر

نہ خارِ دشت ہے نرمی میں خوابِ مخمل ہے
ہر ایک تارِ رگِ سنگ بھی ہے تارِ حریر

ہوا میں ہے یہ طراوت کہ دودِ گلخن بھی
برستا اٹھے ہے آتش سے مثلِ ابرِ مطیر

یہ آیا جوش میں بارانِ رحمتِ باری
کہ سنگ سنگ میں سنگِ یدہ کی ہے تاثیر

ہر ایک خار ہے گل ہر گل ایک ساغرِ عیش
ہر ایک دشت چمن ہر چمن بہشت نظیر

ہر ایک قطرۂ شبنم گہر کی طرح خوشاب
ہر ایک گہر گہر شبچراغ پُر تنویر

کرے ہے صبح شکر خندہ اِس مزے کے ساتھ
کہ جس طرح بہم آمیختہ ہو شکر و شیر

سنوارتی ہے جو شام اپنی زُلفِ مشکیں کو
سوادِ مشکِ ختن پر ہے لاکھ آہو گیر

نہالِ شمع سے ہر شب پُچنے گُلِ شبتو
بہارِ عیش میں گلچیں کی طرح سے گلگیر

ہنسے چراغ تو ایسی ہنسی میں پھول جھڑیں
حیا سے رنگِ گُلِ آفتاب ہو تغییر

رہے ہے چرخ پہ ہر صبح جوں صبوحی کش
بایں درازیِ ریشِ آفتاب ساغر گیر

عجب نہیں ہے کہ آرایشِ زمانہ سے
حنائی پنجہ ہوں تاک و چنار و بید انجیر

چمن میں ہے یہ درختانِ سبز پر جوبن
کہ زہر کھاتے ہیں سبزانِ خطّۂ کشمیر

نہ کیونکہ دیکھ کے گلشن کو یہ پڑھوں مطلع
کہ آئی ہے نظر ایک قدرتِ خدائے قدیر

ظہورِ نرگس و گُل جلوۂ سمیع و بصیر
نسیمِ نکہتِ گُل اطہر و لطیف و خبیر

شمیمِ عیش سے ہے یہ زمانہ عطر آگیں
کہ قرصِ عنبر اگر ہے زمیں تو گرد عبیر

حمل سے حوت تلک جابجا ہیں تصویریں
بنا ہے عالمِ بالا بھی عالمِ تصویر

جہاتِ ستّہ سے بزمِ جہاں ہے وسعت خواہ
کہ ہے ہجومِ نشاط و سرور جمِّ غفیر

زمانہ دشمنِ عشرت کا اِس قدر قائل
سرِ صیام کو دیکھے نہ کوئی بے شمشیر

ہوا ہے مدرسہ یہ بزم گاہِ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدرِ منیر

اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

زمینِ میکدہ یہ خندۂ نشاط انگیز
کہ لائے مے سے ہو دیوارِ قہقہا تعمیر

دیا ہے رنج کو دھو تیرے غسلِ صحت نے
ضمیرِ خلق سے اسے بادشاہِ پاک ضمیر

عجب نہیں یہ ہوا سے کہ مثلِ نبضِ صحیح
کرے اگر حرکت موجِ چشمۂ تصویر

شہنشہا ترے یمنِ شفائے کامل سے
جو لا علاج مرض تھے یہ ہیں علاج پذیر

کہ چوبِ گل کو اگر ماریں بیدِ مجنوں تک
تو صورتِ بشر ہوشمند خوش تقریر

اشارہ فہم ہو ایسا کہ وہ بیان کرے
زبانِ برگ سے گونگوں کے خواب کی تعبیر

جو میلِ کحلِ بصارت ہو کلکِ خطِ غبار
تو چشمِ دائرۂ عین بھی ہو چشم بصیر

نہ موجِ مے کو ہو پیچش نہ شیشے لے ہچکی
گئی جہاں سے یہ بیماریِ فواق و زحیر

نہ برق کو تپ لرزہ نہ ابر کو ہو زکام
نہ آب میں ہو رطوبت نہ خاک میں تبخیر

بدل گئی ہے حلاوت سے تلخیٔ دارو
شرابِ تلخ بھی ہو میکشوں کو شکر و شیر

قوی ہے قوتِ تاثیر سے دوائے طبیب
غنی قبول کی دولت سے ہے دعائے فقیر

شکستِ دل کو ترے یمنِ تندرستی سے ق
کرے درست اگر مومیائیِ تدبیر

تو موئے کاسۂ چینی کو چارہ سازِ قضا
نکالے کاسۂ چینی سے مثلِ موئے خمیر

کھجائے سر جو کبھی مفسدانِ سرکش کا
علاجِ خارشِ سر ہو یہ ناخنِ شمشیر

بنا ہے نقشِ شفاخانۂ ہزار شفا
ہر ایک خانۂ تعویذ صاحبِ تکسیر

ہر ایک اسمِ عزیمت میں اسمِ اعظم ہے
ہر ایک نسخہ شفا میں ہے نسخۂ اکسیر

رہا نہ کوئی گرفتارِ رنجِ عالم میں
چھٹے جو تیرے تصدق میں مجرمانِ اسیر

شہا ہے دم سے ترے زندگانیِ عالم
یہ تیرا دم ہے وہ اعجازِ عیسوی تاثیر

مثالِ خضر تو اے رہنمائے ملت و دیں
جہاں میں پیر ہو پر ہو کرامتوں سے پیر

تو وہ ہے حامیِ دنیا و دیں زمانہ میں
کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو دین کو توقیر

کیا شہانِ سلف نے مسخر ایک جہاں
کیے ہیں تو نے شہنشاہِ دو جہاں تسخیر

سحر سے شام تلک زر فشاں ہے تجھ پہ مہر
نثار کرتا ہے ہر روز ایک گنجِ خطیر

فلک پہ کرتا ہے ہر شب ادا جو سجدۂ شکر
نشانِ سجدہ ہے زیبِ جبینِ ماہِ منیر

یہ روزِ جشن ترے ہے جو اس جہانِ کہن
کہے نہ کوئی دو شنبہ کو بھی جہاں میں پیر

حیات بخشِ جہاں تیرا مژدۂ صحت
جو بخشے خلق کو عمرِ طویل و عیشِ کثیر

ہزاروں سال سرِ ہر صدی نکال کے دانت
ہنسیں اجل پہ جوانوں کی طرح مردمِ پیر

جہاں کو یوں تری صحت کے ساتھ ہے صحت
صحیح جیسے کہ قرآں ہو مع تفسیر

یہ وہ خوشی ہے کہ فربہ ہوں جشن سے روز بروز
ہلالِ بست و نہم کی طرح بدن سے حقیر

پڑھوں ثنا میں تری اب وہ مطلعِ روشن
کہ جس کا مطلعِ خورشید بھی نہ ہوئے نظیر

شہنشہا وہ تری روشنیِ رائے منیر
عقولِ عشرہ کے انوار جس کے عشرِ عشیر

جو ہو نہ تابعِ امرِ شاورہم فی الامر
تو عقلِ کل کو کرے تو نہ ہرگز اپنا مشیر

جو ہیں نکات و معانی بشر کے فہم سے دور
وہ تیرے ذہن میں موجود سب قلیل و کثیر

اگر ہے سہو کو کچھ دخل حافظہ میں تو یہ
نہ اپنا یاد ہے احساں نہ اور کی تقصیر

حیا ہے گر متعلق تری نگاہ کے ساتھ
تو ہے ضمیر کی جانب تیری صفا کی ضمیر

ترا تو سیئہ بھی یوں ہے داخلِ حسنات
کہ جیسے صحبتِ اصحابِ کہف میں قطمیر

کرے ہے سلب تغیر کو ذاتِ حادث سے
زمانہ عدل سے تیرے ہے اعتدال پذیر

مجال کیا کہ ترے عہد میں شریر طرح
اٹھائیں سر کو شرارت سے سرکشانِ شریر

ہوا میں آکے جو کرتا ہے سرکشی شعلہ
تو چٹکیاں دلِ آتش میں لے ہے آتش گیر

ترے نسق سے جو بالکل رہی نہ خوں ریزی
لڑائیوں میں کہیں پھوٹتی نہیں نکسیر

جو پہنچے بتکدہ میں تیرا شورِ دینداری
بلند نالۂ ناقوس سے بھی ہو تکبیر

کیا یہ کفر کو اسلام نے ترے معدوم
کہ کوئی زلفِ بتاں پر نہ کر سکے تکفیر

جہاں میں چشمِ سیہ مستِ یار کا ہو یہ رنگ
جو میکشوں کو تیرا احتساب دے تعذیر

پڑی گلے میں رسن خطِ سرمہ سے اُسکی
رہے مدام وہ گردش میں از پئے تشہیر

وہ برقِ قہرِ خدا تیری تیغِ آتش دم
کہ جس کی آنچ ترے دشمنوں کو نارِ سعیر

جو ہے خدنگ کا تیرے نشانہ چشمِ حسود
تو ہے تفنگ کا تیرے دلِ عدو نخچیر

ترے نہیب سے ہوں شکلِ فلس ماہی الگ
کریں نہ حلقۂ جوہر رفاقتِ شمشیر

جو تیر نکلے کماں سے تری وہ ہو جاوے
طلب میں جانِ عدو کی رواں قضا کا سفیر

ترے ہے خامۂ طغرا نگار میں یہ زور
ق جو کھینچے ایک روش خطِ منحنی وہ لکیر

تو اُس سے ایسی ہوں اشکال ہندسہ پیدا
مٹا دے دیکھ کے اُقلیدس اپنی سب تحریر

وہ روشنی ترے خط میں کہ ابنِ مقلہ اگر
ق لگائے آنکھوں میں سرمہ کی جا تری تحریر

تو ہو یہ نورِ بصارت کہ پڑھ سکے حرف بحرف
جو ہووے لوحِ جبیں پر نوشتۂ تقدیر

رقم میں گر ترے اوصاف کے قصور کرے
زبانِ خامۂ عطارد کی ناک میں دے تیر

ترا سمند ہے وہ تیز رو کہ وقتِ خرام
ق نظر ہو دیدۂ زرقا کی بھی نہ اُس کا نظیر

کہ سیرگاہِ دو عالم ہے راہِ یک روزہ
اور اس کا شرق سے تا غرب عرصہ گاہ سیر

ترے جو فیل کی تعریف خسروا لکھوں
کروں حکایتِ شیریں و کوہکن تحریر

کہ فیل کوہ کچک تیشہ فیلباں فرہاد
وہ دو دو نو دانت صفا ایک ایک جوئے شیر

چلے نہ اشرفیِ آفتابِ عالم میں
خطِ شعاع سے اُس پر جو یہ نہ ہو تحریر

ابوظفر شہِ والا گہر بہادر شاہ
سراج دین نبی سایۂ خدائے قدیر

شہِ بلند نگہ شہریارِ والا جاہ
خدیوِ مہر کلہ خسروِ سپہر سریر

جہاں مسخر و عالم مطیع و خلق مطاع
فلک مؤید و اختر معین و بخت نصیر

زمیں ہو سبز جو تیرے سحابِ بخشش سے
تو بوٹی بوٹی سے ہر خاک کے بنے اکسیر

بچشمِ مہر اگر تیرا نیّرِ اقبال
ق کرے نگاہ سرِ آبجو و آبِ غدیر

تو فلس فلس سے ہو ماہیوں کی وقتِ شکار
نگینِ دستِ سلیماں بدستِ ماہی گیر

نہ ہے ثنا کے لئے تیرے اختتام و تمام
نہ ہے دعا کے لئے تیری انتہا و اخیر

اگرچہ ذوقِ ثنا سنج و مدح خواں تیرا
کرے ہے دل سے دعا یہ سدا فقیرانہ

الٰہی آپ پہ ہو تا زمیں زمیں کو ثبات
فلک پہ چھوڑے نہ تا دامن مسیح حیات

عطا کرے تجھے عالم میں قادرِ قیوم
تنِ قوی و مزاجِ صحیح و عمرِ طویل

غلام پیرِ کہن سال ایک فقیر حقیر
سنا ہے جیب سے کہ رحم خداد عائے فقیر

زمیں پہ تا ہو فلک اور فلک کو ہو تدویر
زمیں پہ خضر کی تا ہو فنا نہ دامن گیر

بجاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر
سپاہ وافر و ملک وسیع و گنج خطیر

میر ببر علی - انیس

خاندانی شاعر ہیں آپ کے دادا میر حسن نے مشہور مثنوی بدر منیر لکھی آپ کے والد میر مستحسن خلیق فن مرثیہ گوئی میں میر ضمیر کے مدِ مقابل تھے عہدِ امجد علی شاہ میں فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ میر صاحب نے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی اور ضروریاتِ فن سے آگاہی حاصل کی۔ اپنے خاندانی کمال میں باپ کے شاگرد تھے۔ پہلے غزل لکھتے تھے۔ پھر پدرِ بزرگوار کی ہدایت کے موافق اُس کو چھوڑ کر سلام۔ مرثیہ۔ نوحے کہنا شروع کیا ان کی بلکہ ان کے گھرانے کی زبان اُردوئے معلیٰ کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں مستند سمجھی جاتی تھی۔ مرثیہ گوئی اس خاندان کا حصہ تھا۔ خود میر صاحب کا کلام ہے ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں　　پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

باوجود اس کے بقول صاحب آبِ حیات۔ میر صاحب کی طبیعت میں انتہا درجہ کا انکسار تھا حسنِ اخلاق کبھی تعلّی شاعرانہ کی اجازت نہ دیتا تھا۔ کسی جلسہ میں اپنا کلام سناتے تو بعض محاورہ پر اتنا کہہ اُٹھتے تھے کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضراتِ لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے۔

اِس پر ایک ایک لفظ کانٹے کی تول- عموماً کم سخن تھے اور بولتے تو وہ فقرہ کہ موتی کی طرح ٹانکنے کے قابل- جب میر ضمیر اور میر خلیق کو ضعیفی نے خانہ نشین کیا میر انیس نے باپ کی جگہ منبر پر لی اُدھر سے مرزا دبیر اِن کے مقابلہ کو نکلے یہ خاندانی شاعر نہ تھے مگر میر ضمیر کے شاگرد رشید تھے- دونوں باکمالوں نے ثابت کر دیا کہ حقیقی اور تحقیقی شاعر ہم ہیں- اور ہم ہیں کہ ہر رنگ کے مضمون- ہر قسم کے خیال ہر ایک حال کا اپنے الفاظ کے جوڑ بند سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں- کہ چاہیں رُلا دیں چاہیں ہنسا دیں- چاہیں تو حیرت کی مورت بنا کر بٹھا دیں ؞

زمانہ بھی آپ کو بہت موافق ملا تھا- بادشاہ سے لے کر اُمرا اور غربا تک شیعہ مذہب رکھتے تھے- جو آپ کے کمال کو خوش اعتقادی اور قدر دانی کی نظر سے دیکھتے تھے- زبانی تعریف اور تعظیم و تکریم کے سوا نقد و جنس کے گراں بہا تحائف اور انعام نذرانہ کے رنگ میں پیش کرتے تھے- انہوں نے ایجادِ مضامین کے دریا بہا دیئے- ایک مقررہ مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا- ہر مرثیہ کا چہرہ نیا- آمد نئی- رزم جُدا- بزم جُدا- اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا- تلوار نئی- نیزہ نیا- گھوڑا نیا- انداز نیا- مقابلہ نیا- صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ- رات کی رخصت- سیاہی کا پھٹنا- نور کا ظہور-

آفتاب کا طلوع۔ مرغزار کی بہار۔ شام ہے تو شامِ غریباں کی اداسی کبھی رات کا سناٹا۔ کبھی تاروں کی چھانو کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ رنگ سے دکھایا ہے۔ غرض جس حالت کو لیا ہے اُس کا سماں باندھ دیا ہے۔ آمدِ مضامین کی انتہا نہ رہی۔ جن مرثیوں کے بند ۴۰۔ ۵۰ سے زیادہ نہ ہوتے تھے وہ ۱۵۰ سے گذر کر ۲۰۰ سے بھی آگے نکل گئے۔ میر صاحب مرحوم نے کم سے کم ۱۰ ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا اور سلاموں کا کیا شمار ہے۔ رباعیاں تو باتیں تھیں *

جب تک لکھنؤ آباد رہا۔ شہر سے باہر نہیں گئے۔ کہ ہمارے زبان کے لطف کو اہلِ لکھنؤ کے سوا دوسرا کیا سمجھے گا۔ لیکن تباہیِ لکھنؤ کے بعد میر انیس نے ۱۸۵۹ء میں عظیم آباد گئے پھر ۱۸۷۱ء میں حیدر آباد تشریف لے گئے وہاں کے لوگوں نے ایسی قدر دانی کی جیسی کہ چاہیئے *

جس طرح آپ کا کلام لاجواب دیکھتے ہو اسی طرح آپ کا پڑھنا بھی بے مثال تھا۔ آپ کی آواز آپ کا قد و قامت۔ آپ کی صورت کا انداز غرض ہر شئے اس کام کے لئے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ میر صاحب کی سخن آفرینی۔ صفائیِ کلام۔

حسنِ بیان۔ لطفِ محاورہ ہر جگہ ان کے کلام کی زینت تھی خواہ وہ خود پڑھیں یا کوئی دوسرا پڑھے۔ میر انیس مرحوم نے ۲۹ ر شوال سنہ ۱۲۹۱ ہجری بروز جمعہ لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ آپ کے مرثیوں کی کئی جلدیں شایع ہو چکی ہیں ۔٭
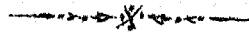
مناجات

یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر ۔ اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر ۔ گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری ۔ بلبل کی زباں پہ ہے تری شکرگزاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرتِ باری ۔ پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری
وہ گل ہوں عنایت چمنِ طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو

غواصِ طبیعت کو عطا کر وہ لآلی ۔ ہو جن کی جگہ تاجِ سرِ عرش پہ خالی
ایک ایک لڑی نظمِ ثریا سے ہو عالی ۔ عالم کی نگاہوں سے گرے نطقِ شمالی
سب ہوں دُرِ یکتا نہ علاقہ ہو کسی سے
نذر اُن کے یہ ہوں جنہیں رشتہ ہے نبی سے

بھر دے دُرِ مقصود سے اس درجِ دہاں کو ۔ دریائے معانی سے بڑھا طبعِ رواں کو
آگاہ کر اندازِ تکلم سے زباں کو ۔ عاشق ہو فصاحت بھی وہ دے حسنِ بیاں کو

تحسین کا سموات[1] سے غل تا بہ سمک[2] ہو
ہر گوش بنے کانِ ملاحت وہ نمک ہو

ساقی کے کرم سے ہو وہ دور اور چلیں جام
ہر مست فراموش کرے گردشِ ایام
جس میں عوضِ نشہ ہو کیفیتِ انجام
صوفی کی زباں بھی تشنہ نہیں ہے ناکام

ہاں بادہ کشو پوچھ لو میخانہ نشیں سے
کوثر کی یہ موج آ گئی ہے خُلدِ بریں سے

آؤں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے گر بزم
قطعِ سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم
خیبر[3] کی خبر لائے مری طبع اولوالعزم
دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکۂ رزم

جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

ہو ایک زباں ماہ سے تا مسکنِ ماہی
جرأت کا دھنی تُو ہے یہ چلّائیں سپاہی
عالم کو دکھا دے یہ برش سیفِ الٰہی
لاریب ترے نام پہ ہے سکّۂ شاہی

ہر دم یہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا
تو مالک و مختار ہے اِس طبل و علم کا

۱ سموات جمع سما بمعنی آسمان۔ ۲ کہا جاتا ہے کہ زمین ایک گائے کی سینگ پر اور گائے ایک مچھلی کی پشت پر کھڑی ہے۔ مچھلی کو عربی میں سمک کہتے ہیں۔ ۳ مدینہ کے قریب ترائی میں ایک مقام خیبر کے نام سے مشہور ہے یہاں یہودی کی ایک بستی تھی جو محمد صلعم کے زمانے میں حضرت علی کے قوتِ بازو سے فتح ہوئی تھی۔

حضرتِ قاسم کی لڑائی

نیزہ ہلا کے جانبِ قاسم بڑھا وہ بل
دولھا نے مسکرا کے صدا دی سنبھل سنبھل
گھوڑا نہ گر پڑے ترے لنگر سے منہ کے بل
تو ہے فرس پہ اور تری گردن پہ ہے اجل
ضیغم ہیں بیشۂ اسدِ ذوالجلال کے
کیجو سناں کے وار ذرا دیکھ بھال کے

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی اٹھان
چمکی انی تو برق پکاری کہ الامان
اک بند باندھ کے جو فرس سے کہا کہ ہاں
ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

قاسم نے زور سے جو انی پر رکھی انی
بھاگا شقی کے جسم سے زورِ تہمتنی
بگڑا جو ڈھنگ جان پہ ظالم کے آبنی
تھی اس سناں کی نوک کہ ہیرے کی تھی کنی
اُڑ کر گری زمیں پہ سناں اس نکان سے
گرتا ہے جیسے تیرِ شہاب آسمان سے

جھنجھلا کے چوبِ نیزہ کو لایا وہ فرق پر
قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ ماری بجائے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر
جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا

دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھا کے جب
قبضے میں لی کمان کیانی بصد غضب
چلّے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب
تیوری چڑھائی قاسمِ نوشاہ نے بھی تب
تیر نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّا اتر گیا

بولے یہ مسکرا کے جگر گوشۂ حسن
رخ پھیر پھیر لو نہ او ستم ایجاد پیل تن
چلّائے بڑھ کے حضرتِ عباس صف شکن
کیا خوب تجھ کو یاد ہیں تیر افگنی کے فن
دیکھا ہمارے شیر کی چتون کی شان کو
دعوےٰ ہے کچھ ابھی تو چڑھا لے کمان کو

دو سمت سے چلے جو ملامت کے اس پہ تیر
چلّایا تیغ تیز علم کر کے وہ شریر
ہاں اے حسن کے لعلِ بدخشاں بدہ بگیر
نکلی چمک کے پاس سے بھی تیغِ قضا نظیر
چمکا کے تیغ تیز جو قاسم سنبھل گئے
سمجھا جو کچھ فرس کے بھی تیور بدل گئے

مانندِ شیر غیظ میں آیا وہ پیل تن
آنکھیں ابل پڑیں صفت آہوئے ختن
ماری زمیں پہ ٹاپ کہ لرزا تمام رن
چلّائے سب کہ گھوڑے پہ بھی لو چڑھا ہے رن
کھنچیں زمیں کی اس کی نگاہوں سے ہل گئیں
وہ دو کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے ہل گئیں

فرفر نفس کی آتی تھی نتھنوں سے جب صدا
کہتے تھے لوگ سب کہ ہے زفرف یہ بادپا
دشمن کو گھورتا ہے دہانا چبا چبا
غل تھا کہ بس فرس ہو تو ایسا ہو باوفا
دشمن کو کیا نبرد میں بچنے کی آس ہو
لڑلے کٹاریاں یہ فرس جس کے پاس ہو

چھل بل دکھائی فوج کو دوڑا تھما اُڑا
صورت بنائی جست کی سمٹا جما اُڑا
دیکھی زمیں کبھی کبھی سوئے سما اُڑا
مثلِ سمند بادشہِ انّما اُڑا
جن تھا پری تھا سحر تھا آہو شکار تھا
گویا ہوا کے گھوڑے پہ گھوڑا سوار تھا

دونوں طرف سے چلنے لگے وار یک بیک
دو بجلیاں دکھانے لگیں ایک جا چمک
تکنے لگے فلک کے دریچوں سے سب ملک
اک زلزلہ تھا اوجِ ثریا سے تا سمک
چہرے پہ آفتاب کے مقتل کی گرد تھی
یہ خوف تھا کہ دھوپ کی رنگت بھی زرد تھی

ہر بار جانبین سے ہوتے تھے وار رد
تھا حرب و ضرب میں وہ شقی بھی بلائے بد
جب بڑھ کے وار کرتا تھا وہ بانیِ حسد
کہتا تھا بازوئے شہِ دیں یا علی مدد
یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغِ جہول کو
جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

لایا جو حرفِ سخت زباں پر وہ بدخصال
جھپٹا مثالِ شیرِ درندہ حسن کا لال

گھوڑے سے بس ملا دیا گھوڑا الصد جلال — اتنے بڑھے کہ لڑ گئی اُس کی سپر سے ڈھال

اوجھڑ لگی کہ ہوش اُڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھ دئے سر پر سمند کے

عبّاس نامدار نے پہلو سے دی صدا — ہاں اب نہ جانے دیجیو احسنت مرحبا
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا — سُنتے ہی یہ فرس سے فرس کو کیا جُدا

گھوڑا ابھی اس طرف کو اُدھر ہو کے پھر پڑا
مارا کمر کا ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

جنگل کی رات

گذرا جو وہ دن شامِ مصیبت نظر آئی — پردے میں چھپا مہر تو ظلمت نظر آئی
ماتم کی غریبوں کے علامت نظر آئی — کھولے ہوئے گیسو شبِ آفت نظر آئی

راحت دلِ عالم سے فراموش ہوئی تھی
دنیا غمِ سرور میں سیہ پوش ہوئی تھی

جنگل کی اُداسی تو وہ اور شام کا ہونا — بچّوں کا وہ کھانے کے لئے بھوک میں رونا
پانی کی تمنّا میں وہ مُنہ اشکوں سے دھونا — فاقوں میں کہاں نیند کہاں چین سے سونا

لُو چلتی تھی جب خاک میں اٹ جاتے تھے بچّے
ماؤں سے اندھیرے میں لپٹ جاتے تھے بچّے

آتی تھی درندوں کی صدا گونجتے تھے شیر
گل ہونے میں شمعوں کے نہ لگتی تھی ذرا دیر
سب فرش پہ آندھی سے خس و خاک کا تھا ڈھیر
کرتی تھی اندھیرے میں ہوا اور بھی اندھیر

جب اُٹھتی تھیں چوبیں تو جھکا جاتا تھا خیمہ
بھرتی تھی ہوا جب تو اُڑا جاتا تھا خیمہ

اُجڑے ہوئے جنگل کی ڈرانی وہ صدائیں
دھڑکا تھا کہ جائیں نہ کہیں بچوں کی جانیں
تھرّاتا تھا کوئی کوئی پڑھتا تھا دعائیں
کس طرح اس آفت میں جگہ امن کی پائیں

یاں ان کے پانی سے چھٹے کھانے سے چھوٹے
ہو صبح تو جانیں کہ سیہ خانے سے چھوٹے

خیمہ کو خدا گردشِ گردوں سے بچائے
حافظ الم و ہیبتِ ہاموں سے بچائے
خالق ستمِ لشکرِ ملعوں سے بچائے
اللہ ہمیں آفتِ شبخوں سے بچائے

منزل پہ یہ آفت یہ تباہی نہیں دیکھی
ہے ہے کسی شب میں یہ سیاہی نہیں دیکھی

صبح کی بہار

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح
ہونے لگا اُفق سے ہویدا نشانِ صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا

عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

خورشید نے جو رخ سے اٹھایا نقاب شب
در کھل گیا سحر کا ہوا بند باب شب
انجم کی فرد فرد سے لیکر حساب شب
دفتر کشائے صبح نے الٹی کتاب شب
گردوں پہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطان غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

پہونچا جو مہر مہر سے فرمان عزل شب
گردوں پہ عاملان سحر کا ہوا نصب
منشئ آسماں مع دفتر ہوا طلب
بس جا بجا سے اٹھ گئی انجم کی فوج سب
تا صبح فرد فرد میں بیگانگی ہوئی
برخاست کی چراغوں کے پروانگی ہوئی

یوں گلشن فلک سے ستارے ہوئے رواں
چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گل مہتاب پہ خزاں
مرجھا کے گر گئے ثمر شاخ کہکشاں
دکھلائے طور باد سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور
یاد خدا میں زمزمہ پردازی طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور
خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو ملک آسمان پہ
جاری تھا ذکر قدرت حق ہر زبان پہ

وہ سرخیِ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار — وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار — پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

ایضاً

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور — دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور — وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور
گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوائیں سبزۂ صحرا کی وہ لہک — شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک — ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربانِ صنعتِ قلمِ آفریدگار — تھی ہر ورق پہ صنعتِ ترصیعِ آشکار
عاجز ہے فکرتِ شعرائے ہنر شعار — ان صنعتوں کو پائے کہاں عقلِ سادہ کار
عالم تھا محوِ قدرتِ ربِّ عباد پر
مینا کیا تھا وادیِ مینو سواد پر

وہ نور اور وہ دشتِ سہانا سا وہ فضا　دُرّاج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گُل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا　سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں سے سبز سبز شجر سُرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گُل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار　پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار　بالائے نخل ایک جو بلبل تو گُل ہزار
خواہاں تھے زہرِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم　کوکو کا شور نالۂ حق سرّہٗ کی دھوم
سُبحان ربّنا کی صدا تھی علی العموم　جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گُل فقط نہ کرتے تھے ربِّ علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح

چونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار　اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حیُّ یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار　تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیلِ کردگار
طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

مرزا سلامت علی - دبیر

میر انیس کی طرح خاندانی شاعر نہ تھے اور کسی نوع کی شاعری کے لئے خاندانِ شعرا سے ہونا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ شعر و سخن طبعی ذوق اور فطرتی مذاق ہے۔ مرزا صاحب کو بچپن سے مرثیہ خوانی کا شوق تھا اس شوق نے منبر کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے عرشِ کمال پر پہونچا دیا۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے اور جو کچھ اُستاد سے پایا اُسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا۔ آپ نے سوائے مرثیہ کے شاذ و نادر کوئی نظم لکھی ہوگی۔ ابتدا سے اِس شغل کو وسیلۂ نجات سمجھ کر تمام عمر مرثیہ ہی لکھتے رہے۔ طبیعت بھی ایسی پر سوز و گداز پائی تھی جو اس فن کے لئے نہایت موزوں اور مناسب تھی۔ اِس کے علاوہ ان کی سلامت روی۔ پرہیزگاری۔ مسافر نوازی اور سخاوت نے صفتِ کمال کو زیادہ تر رونق دی تھی۔ نواب شرف الدولہ کے ہاں مجلس میں پہلے مرزا دبیر کا مرثیہ ہوتا تھا اُس کے بعد اُن کے اُستاد میر ضمیر پڑھتے تھے۔ پھر ایک مجلس میں اُستاد شاگرد کا اجتماع موقوف ہو گیا۔ زمانہ کی خاصیتِ طبعی ہے کہ جب نباتات پرانے ہو جاتے ہیں تو اُنھیں الگ کر کے نئے پودے لگاتا ہے۔ میر ضمیر اور میر خلیق کو بڑھاپے کے

پلنگ پر بٹھایا دبیر اور انیس کو اُن بزرگوں کی جگہ منبر پر ترقی دی۔

مرزا صاحب شوکتِ الفاظ۔ مضامین کی آمد۔ اس میں جا بجا غم انگیز اشارے۔ درد خیز کنائے۔ المناک اور دل گداز انداز جو مرثیوں کی غرضِ اصلی ہے۔ ان وصفوں میں بادشاہ تھے یہ اعتراض حریفوں کا صحیح ہے کہ بعض ضعیف روایتیں اور دل خراش مضامین ایسے نظم ہو گئے ہیں جو مناسب نہ تھے لیکن انسان کی طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب ایک مقصود کو مدِ نظر رکھ کر اُس پر متوجہ ہوتا ہے تو اور پہلوؤں کا خیال بہت کم رہتا ہے۔ انہیں ایسی مجلسوں میں پڑھنا ہوتا تھا جہاں ہزارہا آدمی دوست دشمن جمع ہوتے تھے۔ تعریف کی بنیاد گریہ و بکا۔ لطفِ سخن اور ایجادِ مضامین پر ہوتی تھی۔ کمال یہ تھا کہ سب کو رُلانا اور سب کے مُنہ سے تحسین کا نکلنا اس شوق کے جذبہ اور فکرِ ایجاد کی محویت میں جو کچھ قلم سے نکل جائے تعجب نہیں۔

بقائے سلطنتِ خاندانِ نیشاپوری تک مرزا دبیر لکھنؤ سے باہر نہیں نکلے۔ لیکن تباہیِ لکھنؤ کے بعد سنہ ۱۸۵۸ء میں مرشد آباد تشریف لے گئے۔ اور پھر الہ آباد اور بنارس بھی جایا کئے۔ مرزا صاحب نے ۲۹ محرم سنہ ۱۲۹۲ھ کو ۷۲ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اس مدت میں کم سے کم تین ہزار مرثیہ لکھا ہوگا۔ سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ ایک مرثیہ بے نقط لکھا جس کا مطلع یہ ہے

ہم طالعِ ہما مرادہم رسا ہوا

اس میں اپنا تخلص بجائے دبیر کے عطارد لکھا ہے کہ وہ بھی دبیرِ فلک ہے۔ کچھ شک نہیں کہ آپ کے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہو گیا۔ مرزا دبیر کے پڑھنے میں میر انیس کی سی خوش ادائی نہیں تھی لیکن حسنِ قبول اور فیضِ تاثیر خدا نے عطا کیا تھا۔ اِن کا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تھا تو رونے رُلانے میں کامیاب ہوتا تھا اور یہی اس کلام کی علتِ غائی ہے۔

صبح کا سماں

گلگونۂ شفق جو ملا حورِ صبح نے
گرمی دکھائی روشنی طورِ صبح نے
اسپندِ مشکِ شب کو کیا نورِ صبح نے
ٹھنڈے سے چراغ کردئے کافورِ صبح نے
لیلائے شب کے حسن کی دولت جو لُٹ گئی
افشاں جبیں سے نجمِ درخشاں کی چھٹ گئی

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشانِ صبح
باندھا عمامہ نور کا پہنا کتانِ صبح
سلطانِ صبح نے کیا قصدِ اذانِ صبح
چرخِ چہارمی پہ گیا خطبہ خوانِ صبح
رخ سب کے سوئے قبلۂ امید ہوگئے
سرگرمِ سجدہ عیسیٰ و خورشید ہوگئے

پرچم کشادہ ہوا علمِ زر فشانِ مہر
آیا عروج پہ شہ گیتی ستانِ مہر
لی روز نے پناہ بزیرِ نشانِ مہر
اور لشکرِ شعاع نے تانی سنانِ مہر
نیزہ کرن کا دیدۂ گردوں میں ڈال کر
مغرب میں پھینکی رات کی پتلی نکال کر

بڑھکر نقیبِ نور پکارا سحر سحر
فرمانِ نجوم و بدر کو پہونچا بدر بدر
ذرّوں میں نورِ مہر در آیا قمر قمر
لوٹا سحر نے معدنِ شبنم گہر گہر

برقع جو اُٹھ گیا تھا رُخِ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبحِ ملمّع نقاب کا

لڑائی کی طیّاری

کہتا ہے تول کر کوئی شمشیرِ آبدار
کہتا ہے کوئی بڑھ کے یہ اکبرؑ سے بار بار
اے تو سہی کہ چھین لیں میدانِ کارزار
کب تک کریں امام کے آنے کا انتظار
شبلِ امام آپ بھی مالک ہمارے ہیں
مشتاقِ اذن تابعِ فرماں تمہارے ہیں

کہتا ہے کوئی چوم کے عبّاسؑ کے قدم
رن کی طرف حضور بڑھیں لیکے اب علم
مصروف ہیں جو شاہ عبادت میں کیا ہے غم
دیکھیں تو آپ کرتے ہیں کیا کام آج ہم
لاکھوں کا ایک حملے میں مُنہ پھیر دیتے ہیں
کس طرح اِن سے طبل و علم چھین لیتے ہیں

اِک نے کہا یہ بڑھ کے مناسب نہیں ہے حضور
کہتا ہے ہاتھ جوڑ کے یہ کوئی ذی شعور
بڑھیئے تو اک قدم کہ گھٹے فوج کا غرور
کافی ہے حکم آپ کا بڑھنا نہیں ضرور
حضرت کا نام لیکے جو حملہ کرے غلام
مُردوں سے رن تو روحوں سے دوزخ بھرے غلام

زیرِ علم عزیزوں کے گلدستے کی بہار
طوبیٰ کے سایہ میں چمنِ خلد آشکار
بو باس وہ کہ عطرِ جناں جس پہ ہو نثار
دل کھل رہے ہیں شوقِ شہادت میں غنچہ وار

کوئی تھا سبز پوش، کوئی سرخ پوش تھا
مرنے کی آرزو تھی شجاعت کا جوش تھا

گھوڑا

آہو شم و عقاب دم و ہمسرِ ہما
ضیغم جبین و فیل تن و برقِ تیز پا
سیلِ جبال افگن و طوفانِ قہر زا
فرمانِ غیب حکمِ قدر نائبِ قضا

راکب دمِ وغا جسے زیر و زبر کرے
یہ اس کے سر پہ موت سے پہلے گذر کرے

کھنچتی نہیں پر توسنِ چالاک کی تصویر
عاجز میں نہیں ہوں جو ہوا کو کروں تسخیر
آتا ہی نہیں ذہن میں کیا کیجئے تدبیر
دل آپ کو حیرت زدہ عقل آپ کو دلگیر

ہرگز صفتِ اسپ ہنرمند نہ ہوگی
اس شیشۂ دل میں یہ پری بند نہ ہوگی

ہے رعد ہوا میں تو یہ ہے کبک ادا میں
یہ موج ہے دریا میں یہ بجلی ہے ہوا میں
یہ حور ہے فردوس میں بلقیس سبا میں
آہو ہے تگاپو میں تو ہے شیر وغا میں

دل اس پہ سلیمانؑ کا پروانہ ہوا ہے
کیسے جو پری کہتا ہے دیوانہ ہوا ہے

تلوار

چھل بل تھی چھلاوہ تھی طلسمات تھی اسرار
نیزہ کہیں، خنجر تھی کہیں اور کہیں تلوار
چالاک، سبکسار، طرحدار، نمودار
بجلی تھی کسی جا، تو کہیں نور کہیں نار

سیماب تھی، سیلاب تھی، طوفان تھی، ہوا تھی
شعلہ تھی، شرارہ تھی، قیامت تھی، بلا تھی

جس صف پہ گری صاف صفائی نظر آئی
جھپٹی جو پرے پر تو لہو میں یہ بھر آئی
جس غول پہ چمکی تو ہوا غل کدھر آئی
اک اک کو خبر بھی نہ رہی اپنی پرائی

لہرا کے جو بیٹھی، تو جگر کاٹ کے اٹھی
ناگن کی طرح شبنم خوں چاٹ کے اٹھی

صورت میں مہ نو، تو چمک مہر سے افزوں
لب تشنہ تھی ایسی کہ ہزاروں کا پیا خوں
وہ باڑھ کہ اک دم میں بہا خون کا جیحوں
ہر وار میں تھا رنگ لڑائی کا دگرگوں

گٹھنوں سے بیابان بلا پاٹ رہی تھی
مل مل کے لعینوں کے گلے کاٹ رہی تھی

اعدا کے پرے خون میں بھر جاتی تھی تلوار
جوں سیل سروں پر سے گذر جاتی تھی تلوار

دو کر کے سپر تا بہ کمر جاتی تھی تلوار
حاضر تھی قضا ساتھ جدھر جاتی تھی تلوار

سر پہ جو پڑی تیر گئی دامنِ زیں تک
اُتری سرِ زیں سے تو گئی گاوِ زمیں تک

خواجہ الطاف حسین حالی

چُپ کی داد

اے ماؤ بہنو بیٹیو! دُنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں۔ شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں دُکھ سُکھ میں راحت تم سے ہے
تم ہو تو غربت ہے وطن۔ تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس جینے کی حلاوت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو۔ عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا۔ طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا۔ انساں عبارت تم سے ہے
مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنا کب کا کھو
دنیا میں اے ستونتیو! لے دے کے اب ست تم سے ہے

مونس ہو خاوندوں کی تم۔ غمخوار فرزندوں کی تم
تم بن ہے گھر ویران سب گھر بھر میں برکت تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی۔ ڈھارس ہو تم بے کار کی
دولت ہو تم نادار کی عسرت میں عشرت تم سے ہے
آتی ہو اکثر بے طلب۔ دنیا میں جب آتی ہو تم
پر موہنی سے اپنی یہاں۔ گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم
پر سارے کنبے کی رہیں۔ بچپن سے خدمت گار تم
ماں باپ کے حکموں پہ پتلی کی طرح پھرتی رہیں
غمخوار باپوں کی رہیں۔ ماؤں کی تابعدار تم
دن بھر پکانا ریندھنا سینا پرونا ٹانکنا
بیٹھیں نہ گھر پر باپ کے۔ خالی کبھی زنہار تم
راتوں کو چھوٹے بھائی بہنوں کی خبر اٹھ اٹھ کے لی
بچہ کوئی سوتے میں رویا۔ اور ہوئیں بیدار تم
سسرال میں پہونچیں تو وہاں۔ اک دوسرا دیکھا جہاں
جا اتریں گویا دیس سے پر دیس میں اک بار تم

وہاں فکر تھی ہر دم یہی۔ ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی۔ پاؤ نہ وہاں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر۔ سسرے کا دل میلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کی۔ کھٹکو نہ مثلِ خار تم
پالا بڑوں سے گر پڑے۔ بد خو ہوں سب چھوٹے بڑے
چتون پہ میل آنے نہ دو۔ گو دل میں ہو بیزار تم
غم کو غلط کرتی رہو سسرال میں ہنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خونِ جگر

شادی کے بعد ایک کو۔ تھی آرزو اولاد کی
تم پھنس گئیں جنجال میں۔ خالق نے جب اولاد دی
دردوں کے دکھ تم نے سہے۔ جاپے کی جھیلیں سختیاں
جب موت کا چکھا مزا۔ تب تم کو یہ دولت ملی
میکے میں اور سسرال میں۔ سب کے ہوئے دل باغ باغ
گھر میں اُجالا تو ہوا۔ پر تم پہ بپتا پڑ گئی
کھانا پہننا اوڑھنا اپنا۔ گئیں سب بھول تم
بچوں کے دھندے میں تمہیں۔ اپنی نہ کچھ سدھ بدھ رہی

تب تک بھی کچھ خبر تھی جب تک بھلے چنگے تھے سب
پر سامنا آفت کا تھا۔ گر ہو گیا ماندہ کوئی
سولی پہ دن کٹنے لگے۔ راتوں کو نیندیں اڑ گئیں
اک اک برس کی ہو گئی۔ ایک ایک پل اک اک گھڑی
بچوں کی سیوا میں تمہیں گزرے ہیں جیسے دس برس
قدر اس کی جانے گا وہی۔ دم پر ہو یوں جس کے بنی
کی ہے مہم جو تم نے سر۔ مردوں کو اس کی کیا خبر
جانے پرائی پیر وہ جس کی بوائی ہو پھٹی
تھا پالنا اولاد کا مردوں کے بوتے سے سوا
آخر یہ اے دکھیاریو! خدمت تمہارے سر پڑی
پیدا اگر ہوتیں نہ تم۔ بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اٹھتے دو دن میں۔ اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

لیتیں خبر اولاد کی۔ مائیں نہ گر بچپن میں یہاں
خالی کبھی کا نسل سے آدم کی ہو جاتا جہاں
یہ گوشت کا اک لوتھڑا پروان چڑھتا تھا کس طرح
چھاتی سے لپٹائے نہ ہر دم رکھتی گر بچے کو ماں

وہ دین اور دُنیا کے مصلح جن کے وعظ اور پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا دُنیا میں نورِ حق عیاں
وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے
ظاہر ہوئے عالم میں اسرارِ زمین و آسماں
وہ شاہِ کشور گیر اسکندر کہ جس کی دھاک سے
تھے بید کے مانند لرزاں تاجدارانِ جہاں
وہ فخرِ شاہانِ عجم کسرے کہ جس کے عدل کی
مشرق سے تا مغرب زبانوں پر ہے جاری داستاں
کیا پھول پھل یہ سب انہیں کمزور پودوں کے نہ تھے؟
سینچا تھا ماؤں نے جنہیں خونِ جگر سے اپنے یہاں
کیا صوفیانِ با صفا کیا عارفانِ با خدا
کیا انبیا کیا اولیا کیا غوث[1] کیا قطبِ[2] زماں
سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑے
وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

---

[1] وہ دو شخص جو قطب کے دائیں بائیں رہتے ہیں۔

[2] وہ ولی جس کے قبضہ میں حکمِ الٰہی سے کسی شہر یا ملک کا انتظام معنوی ہوتا ہے۔

افسوس دُنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا
اکثر تمہارے قتل پہ قوموں نے باندھی ہے کمر
دیں تا کہ تم کو یک قلم ۔ خود لوحِ ہستی سے مٹا
گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمہارا تھا نہ یاور کوئی جز ذاتِ خدا
زندہ سدا جلتی رہیں ۔ تم مُردہ خاوندوں کے ساتھ
اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا
بیاہی گئیں اُس وقت تم جب بیاہ سے واقف نہ تھیں
جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا
بیاہا تمہیں ماں باپ نے اے بے زبانوں ! اس طرح
جیسے کسی تقصیر پہ مجرم کو دیتے ہیں سزا
گزری اُمید و بیم میں جب تک رہا باقی سُہاگ
بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا
تم سخت سے سخت امتحاں دیتی رہیں پر رائگاں
کبھی تم نے جانیں تک فدا کر ڈالیں لیکن بے وفا

گو صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا انعام یہاں
پر جو فرشتہ سے نہ ہو وہ کر گئیں تم کام یہاں

کی تم نے اِس دارالمحن میں جس تحمّل سے گذر
زیبا ہے گر کہئے تمھیں فخرِ نبی نوعِ بشر
جو سنگدل سفّاک پیاسے تھے تمہارے خون کے
اُن کی تو ہیں بے رحمیاں مشہورِ عالم ہیں مگر
تم نے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ
شوہر ہوں اس میں یا پدر یا ہوں برادر یا پسر
اُلفت تمہاری کر گئی گھر دل میں جس بے درد کے
وہ بدگماں تم سے رہا اے بے نصیبو! عمر بھر
گو نیک مرد اکثر تمہارے نام کے عاشق رہے
پر نیک ہوں یا بد رہے سب متفق اس رائے پر

۱؎ بے مروّت۔ سنگدل۔ اس لفظ کا اطلاق ہمیشہ اُس شخص پر ہوتا ہے جس کے دل میں محبت ہوتی ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جن عورتوں سے خاوندوں کو یا جن بہنوں سے بھائیوں کو زیادہ محبت ہوتی ہے اُنہیں سے بدگمانی بھی زیادہ ہوتی ہے۔

جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یہاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گمنام دنیا میں رہو
ہو تم کو دنیا کی نہ دنیا کو تمہاری ہو خبر
جو علم مردوں کے لئے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سربسر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

گذرے تھے جگ تم پر کہ ہمدردی نہ تھی تم سے کہیں
تھا منحرف تم سے فلک برگشتہ تھی تم سے زمیں
دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پا کر آدمی بننا تمہیں زیبا نہیں
یہاں تک تمہاری ہجو کے گائے گئے دنیا میں راگ
تم کو بھی دنیا کی کہن کا آگیا آخر یقیں

علم و ہنر سے رفتہ رفتہ ہو گئیں مایوس تم
سمجھا لیا دل کو کہ ہم خود علم کے قابل نہیں
جو ذلتیں لازم ہیں دنیا میں جہالت کے لئے
وہ ذلتیں سب نفس پر اپنے گوارا تم نے کیں
سمجھا نہ تم کو ایک دن مردوں نے قابل بات کے
تم بیبیاں کہلائیں لیکن لونڈیاں بن کر رہیں
آخر تمہاری چپ دلوں میں اہل دل کے چُبھ گئی
سچ ہے کہ چپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں
بارے زمانہ نیند کے ماتوں کو لایا ہوش میں
آیا تمہارے صبر پر دریائے رحمت جوش میں

نوبت تمہاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے
انصاف نے دھندلی سی ایک اپنی جھلک دکھلائی ہے
گو ہے تمہارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا
پر حل ہر اک مشکل یوں ہی دُنیا میں ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کے سدا
پر فتح جب پائی - سچائی ہی نے آخر پائی ہے

رُباعیات

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دُنیا
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

بُلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہمکو چھوڑا
بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

زاہد کہتا تھا جان ہے دین پر قربان
کی عرض کسی نے کیجئے اب کیا ہے صلاح
پر آیا جب امتحان کی زد پر ایمان
فرمایا کہ بھائی جان ہی ہے تو جہان

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے یہ اتنی ہے خبر
یا فکر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

نیکوں کو نہ ٹھیرا ہو بد اسے فرزند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ایک آدھ ادا اُن کی اگر ہو نہ پسند
ہوں اُس میں اگر گلے سڑے دانے چند

تا زیست وہ محوِ نقشِ موہوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے
جو طالبِ دوستانِ معصوم رہے
صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

جو کرتے ہیں کچھ۔ زباں سے کہتے ہیں وہ کم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حسنِ گفتار
ہوتے نہیں ساتھ جمع۔ دم اور قدم
بس اُتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

ممکن ہے کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں
عنبر کو نہ لیں مفت یہ امکاں ہے مگر
پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سرگیں

پوچھا جو کل انجامِ ترقیِ بشر
باقی نہ رہیگا کوئی انساں میں عیب
یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنسکر
ہو جائیں گے پھل پھلا کے سب عیب ہنر

یہاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
جو کرتے ہیں کام اُنکو جلدی بھگتاؤ
آتا ہے اگر آج۔ تو کل جاتا ہے
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان
اولاد کو سستی پہ قناعت کا گمان
بچے آوارہ اور بےکار جوان
ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان
برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشان
مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقان
یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

جب تک کہ نہ ہو دشمنِ اخواں پکّا
ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکّا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے
سنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکّا

ہے تجھ سے نہال جیسی مغرب کی زمیں
مشرق کو وہ فیض تجھ سے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہِ نخشب کی طرح
رہتی ہیں شعاعیں تری محدود وہیں

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلت سے
عزت نہیں اس کو باپ کی عزت سے
سوچو تو ہے کھات کا نسب بھی عالی
پر اس کو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے

ہیں یار رفیق پر مصیبت میں نہیں
ساتھی ہیں عزیز۔ لیک دولت میں نہیں
اُس بات کی انساں سے توقع ہے عبث
جو نوعِ بشر کی خود جبلّت میں نہیں

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار
دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا ماحصل [illegible]
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور
جو باہمّت تھے بن گئے وہ مختار

اک مردِ توانا کو جو سائل پایا
کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا اُن کی گردن پہ وبال
دے دے کے جنہوں نے مانگنا سکھلایا

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

موجود ہُنر ہوں ذات میں جس کی ہزار
بدخُلق نہو عیب اس میں اگر ہوں دوچار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر
کر حُسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

خان بہادر سید اکبر حسین رضوی

سید اکبر حسین صاحب ۱۸۴۶ء میں بمقام بارہ ضلع الٰہ آباد پیدا ہوئے پرانی وضع کے مکاتب اور نئے فیشن کے سرکاری اسکولوں میں تعلیم پاکر آپ نے ۱۸۶۷ء میں وکالت درجۂ ادنیٰ اور ۱۸۷۳ء میں وکالت درجۂ اعلیٰ کے امتحانات پاس کئے ۱۸۸۰ء میں آپ منصف مقرر ہوئے اور درجہ بدرجہ ترقی کر کے ۱۸۸۸ء میں سب جج اور ۱۸۹۴ء میں جج عدالت خفیفہ اور سشن جج مقرر ہوئے ۱۹۰۳ء میں سید صاحب موصوف نے پنشن حاصل کی اور اب الٰہ آباد میں اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق آپ کو ہمیشہ سے ہے اور لکھنؤ کے مشہور اخبار اودھ پنچ کے زمانۂ شباب میں آپ اس کے ممتاز مضمون نگاروں میں تھے۔ بذلہ سنجی آپ کی طبیعت کا خاص جوہر ہے جو نئے اور دلچسپ پولیٹکل اور سوشل مسائل ہمارے ملک میں پرانی وضع اور نئی تہذیب کے میل جول سے پیدا ہو رہے ہیں انکو بسا اوقات حضرت اکبر اس خوبی سے نظم کر جاتے ہیں کہ جو خاص انہیں کا حصہ ہے۔ آپ کی طبع رسا اکثر روزمرہ کے سوانح اور واقعات ملکی کو بھی نہایت دلکش نظم کا جامہ پہناتی ہے چنانچہ لارڈ کرزن کے دربارِ دہلی کا مرقع جو اس انتخاب میں شامل ہے اِس صنفِ سخن کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

غزلیات

لے گیا تھا طرفِ گورِ غریباں دلِ زار — کیا کہیں تم سے جو کچھ واں کا تماشا دیکھا

وہ جو تھے رونقِ آبادیِ گلزارِ جہاں — سر سے پا تک انہیں خاکِ رہِ صحرا دیکھا

کل تلک محفلِ عشرت میں جو تھے صدر نشیں — قبر میں آج انہیں بے کس و تنہا دیکھا

بسکہ نیرنگئ عالم پہ اسے حیرت تھی — آئینۂ خاکِ سکندر کو سراپا دیکھا

سرِ جمشید کے کاسے میں بھری تھی حسرت — یاس کو معتکفِ تربتِ دارا دیکھا

شورِ بلبل جوشِ گل موجِ نسیمِ انوارِ صبح — اللہ اللہ کس قدر ہیں دلکشا آثارِ صبح

آفتابِ اوجِ سعادت کا ہے وہ روشن نفس — نورِ طاعت جس سے ظاہر ہو وہ ہم آثارِ صبح

جلوۂ حق کے مقابل روئے بت ہے بے فروغ — ہے پیامِ مرگ شمعوں کے لئے دیدارِ صبح

واہ کیا کہنا ہے تیرا اے نسیمِ صبح خیز — تیرے دم سے ہے چمن میں گرمئ بازارِ صبح

عاشقِ دنیا کو کیوں آئے خیالِ آخرت — کس نے پروانے کو پایا شائقِ دیدارِ صبح

عہدِ پیری آ گیا اکبر سنبھالو اپنے ہوش — خوابِ غفلت سے اٹھو پیدا ہوئے آثارِ صبح

بہار آئی کھلے گل زیبِ صحنِ بوستاں ہو کر — عنادل نے مچائی دھوم سرگرمِ فغاں ہو کر

بچھا فرش زمرد اہتمام سبزۂ تر سے | چلی مستانہ وش باد صبا عنبر فشاں ہو کر
عروج نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں | ترانے گائے مرغان چمن نے شادماں ہو کر
بلائیں شاخ گل کی لیں نسیم صبح گاہی نے | ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگین بتاں ہو کر
جوانان چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا | کسی نے یاسمن ہو کر کسی نے ارغواں ہو کر
کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحن گلستاں میں | صدائے نغمۂ بلبل اٹھی بانگ اذاں ہو کر
ہوئے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدہ کو | ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہو کر
زبان برگ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں | خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر
نگاہیں کاملوں کی پڑ ہی جاتی ہیں زمانے میں | کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں | ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں
معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے | شہر تن میں جب کہ خود اپنا پتہ ملتا نہیں
غافلوں کے لطف کو کافی ہے دنیائے خوشی | عاقلوں کو بے غم عقبیٰ مزا ملتا نہیں
کشتیٔ دل کی الٰہی بحر ہستی میں ہو خیر | ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں
غافلوں کو کیا سناؤں داستان عشق یار | سونے والے ملتے ہیں درد آشنا ملتا نہیں
زندگانی کا مزا ملتا تھا جن کی بزم میں | ان کی قبروں کا بھی اب مجھ کو پتا ملتا نہیں
صرف ظاہر ہو گیا سرمایۂ زیب و صفا | کیا تعجب ہے جو باطن باصفا ملتا نہیں
پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر | کوہساروں میں نشان نقش پا ملتا نہیں

نہیں جمتا کسی کا نقش اس دُنیائے فانی میں
حباب آسا مٹا اُبھرا جو بحرِ زندگانی میں

سکونِ قلب کی دولت کہاں دنیائے فانی میں
بس اک غفلت سی ہو جاتی ہے اور وہ بھی جوانی میں

اجل کی نیند آجاتی ہے آخر سُننے والوں کو
قیامت کا اثر پاتا ہوں دنیا کی کہانی میں

حباب اپنی خودی سے بس یہی کہتا ہوا گذرا
تماشا تھا ہوا نے اک گرہ دیدی تھی پانی میں

نہ پوچھ اے ہمنشیں وہ قصۂ عیش و طرب ہم سے
کسے اب یاد ہے اک خواب دیکھا تھا جوانی میں

ختم کیا صبا نے رقص گل پہ نثار ہو چکی
جوشِ نشاط ہو چکا صوتِ ہزار ہو چکی

رنگِ بدِ زمانہ کو دیکھ کے گل نے راہ لی
لطفِ نسیم ہو چکا کاوشِ خار ہو چکی

رنگِ بنفشہ مٹ گیا سنبلِ تر نہیں رہا
صحنِ چمن میں زینتِ نقش و نگار ہو چکی

مستیِ لالہ اب کہاں اسکا پیالہ اب کہاں
دورِ طرب گذر گیا آمدِ یار ہو چکی

رُت وہ جو تھی بدل گئی آئی بس اور نکل گئی
تھی جو ہوا میں نکہتِ مشکِ تتار ہو چکی

ابتک اُسی روش پہ ہے اکبرِ مست و بیخبر
کہدے کوئی عزیزِ من فصلِ بہار ہو چکی

جلوۂ دربارِ دہلی

سر میں شوق کا سودا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا

دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

نظم ہے مجھ کو بادۂ صافی
مانگتا ہوں یاروں سے معافی

شغل یہی ہے دل کو کافی
خیر اب دیکھئے لطفِ قوافی

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا

اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے

گورے دیکھے کالے دیکھے
بینڈ بجانے والے دیکھے

خیموں کا ایک جنگل دیکھا
برھا اور ورنگل دیکھا

اس جنگل میں منگل دیکھا
عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری

پانی تھا ہر پمپ سے جاری
تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

کچھ چہروں پر مردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی

کچھ چہروں پر زردی دیکھی
دل نے جو حالت کردی دیکھی

ڈالی میں نارنگی دیکھی
بیرنگی بارنگی دیکھی
محفل میں سارنگی دیکھی
دہر کی رنگا رنگی دیکھی

اچھے اچھوں کو جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا
بھیڑ میں کھانے جھٹکا دیکھا
دل دربار سے اٹکا دیکھا

ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم
زرّیں جھولیں نور کا عالم
اُن کا چلنا کم کم تھم تھم
میلوں تک وہ چھم چھم چھم چھم

پُر تھا پہلوئے مسجدِ جامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع
روشنیاں تھیں ہر سو لامع
سب کے سب تھے دید کے طامع

سُرخی سڑک پر گھٹتی دیکھی
آتشبازی چھٹتی دیکھی
سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
مفت کی دولت لٹتی دیکھی

چوکی اک چو لکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی
خوب ہی چکھی چکھی دیکھی
شہد اور دودھ کی مکھی دیکھی

ایک کا حصّہ منّ و سلوا
ایک کا حصّہ بھیڑ اور بلوا
ایک کا حصّہ تھوڑا حلوا
میرا حصّہ دور کا جلوا

اوج پہ برٹش راج کا دیکھا
رنگِ زمانہ آج کا دیکھا
پرتو تخت اور تاج کا دیکھا
رُخ کرزن مہراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر
حکمت و دانش اُن کے اندر
تخت میں اُن کے بیسیوں بندر
اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوجِ بخت ملاقی اُن کا
محفل اُن کی ساقی اُن کا

چرخِ ہفت طباقی اُن کا
آنکھیں میری باقی اُن کا

ہم تو اُن کے خیر طلب ہیں
اُن کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں

ہم کیا ایسے ہی سب کے سب ہیں
سب سامانِ عیش و طرب ہیں

انگریزیشن کی شان انوکھی
اُقلیدس کی ناپی جوکھی

ہر شئے عمدہ ہر شئے چوکھی
من بھر سونے کی لاگت سوکھی

جشنِ عظیم اِس سال ہوا ہے
روشن ہر ایک ہال ہوا ہے

شاہی فورٹ میں بال ہوا ہے
قصۂ ماضی حال ہوا ہے

ہے مشہور کوچہ و برزن
طائرِ ہوش تھے سب کے پرزن

بال میں ناچیں لیڈی کرزن
رشک سے دیکھ رہی تھی ہرزن

ہال میں چمکیں آ کے یکایک
بجو تھا اُن کا اوجِ سماتک

زر ہیں تھی پوشاک جھکاجھک
چرخ پہ زہرہ اُن کی تھی گاہک

گو رتھا صدۂ اوجِ فلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی

اسمیں کہاں یہ نوک پلک تھی
بزمِ عشرت صبح تلک تھی

کی ہے یہ بندش ذہن رسانے
سننے ہیں ہم تو یہ افسانے

کوئی مانے خواہ نہ مانے
جس نے دیکھا ہو وہ جانے

ڈاکٹر محمد اقبال

۱۸۷۶ء کا کیا مبارک سال تھا جبکہ یہ اقبال مند فخر قوم حکیم
سرزمین پنجاب میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے
اسکول میں حاصل کی پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوکر علوم اعلیٰ
کی تکمیل کی اور ایم۔ اے کی ڈگری پائی۔ کچھ روز اُسی دارالعلوم میں
معلّمی کی کرسی پر جلوہ فرما رہے۔ بعد ازاں قوانین اور فلسفہ کی تحصیل
کے لئے انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ وہاں سے ال ال۔ ڈی اور بیرسٹر
ایٹ لاہو کر عازم وطن مالوف ہوئے۔ یہاں آکر کچھ عرصہ تک گورنمنٹ کالج
میں بحیثیت پروفیسر لکچر دیتے رہے۔ اور اب لاہور کے مشہور اور کامیاب
بیرسٹروں میں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو شعر و سخن کا مذاق ابتدا سے تھا۔ اوّل اوّل ۱۸۹۹ء میں
انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں ایک پُر تاثیر نظم "نالۂ یتیم" پڑھی
جس میں مسلمانان یتامیٰ کی امداد اور دستگیری کے لئے قوم سے درخواست
کی گئی تھی۔ آپ کا کلام اکثر اخباروں میں شایع ہوتا رہا۔ گو اسلامی جلسوں

کے سوا مشاعروں میں کوئی نظم کبھی نہیں پڑھی جب تک داغ مرحوم زندہ رہے بذریعہ خط و کتابت آپ ان سے استفادہ کرتے رہے۔ زبانِ فارسی سے مناسبت اچھی ہے اور فارسی شعر بھی خوب کہتے ہیں۔ آپ کی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یورپ کے جدید خیالات کو بڑی خوبی کے ساتھ زبانِ اُردو کا جامع پہناتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اُردو شاعری کے اصول اور اُردو زبان کی پاکیزگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ دوسری خصوصیت آپ کے کلام کی یہ ہے کہ شاعرانہ لطافت کے ساتھ فلسفیانہ مضامین کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ کے اشعار میں تصوف اور توحید کے مضامین اکثر پائے جاتے ہیں ؎

ہمارا دیس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جنکے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھکو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

نیا شوالہ

سچ کہدوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا
بوٹوں کو پھونک ڈالا اِس بیر ہی کی لو نے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

آہل کہ غیریت کے پردوں کو پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے جی کی بستی
آ اک نیا شوالہ اِس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اِس کا کلس ملا دیں

پھر اِک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو
اِس ہردوارِ دل میں لا کر جسے بٹھا دیں

سُندر ہو اُس کی صورت چھب اُس کی موہنی ہو
اُس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مرادیں

زنّار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں

پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا
ہر آتما میں گویا اک آگ سی لگا دیں

آنکھوں کی ہے جو گنگا لے کے اُس سے پانی
اِس دیوتا کے آگے اِک نہر سی بہا دیں

ہندوستان لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو
آوازۂ اذاں کو ناقوس میں چھپا دیں

اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اِس آگ میں جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا ستم اُٹھانا اور اُن کو پیار کرنا

پنڈت برج نراین۔ چکبست لکھنوی

وطنِ آبائی شہرِ لکھنؤ ہے یہیں آپ نے تعلیم پائی۔ اور کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر قانون کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے طبقۂ وکلا میں شامل ہوئے۔

شعر و سخن کا مذاق آپ کو ابتدا سے تھا۔ غالباً پہلی غزل ۹ برس کے سن میں لکھی تھی آپ اساتذہ کے کلام کو بڑے ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔ غالب۔ آتش اور میر انیس کے کلام کے توشیدائی ہیں آپ کا کلام بھی میر انیس اور آتش کا انداز لئے ہوئے ہے غزل میں آتش کا طرز اور مسدس میں میر انیس کا رنگ ہے خیالات میں انقلابِ زمانہ کی وجہ سے اختلاف ضرور ہے۔ مگر سلاستِ زبان۔ بندشِ الفاظ۔ اور چستیِ ترکیب میں انہیں اُستادوں کی تقلید پائی جاتی ہے۔ آپ کا یہ خیال بہت صحیح ہے کہ محض نئے خیالات کو شعر کا جامہ پہنا دینا شاعری نہیں ہے۔ نئے خیالات ضرور نظم کئے جائیں مگر زبان اور اسلوبِ بیان سے لطافت اور پاکیزگی کا جوہر نہ جانے پائے کیونکہ کلام کو بندشِ الفاظ سے مرصع کرنا تکلف نہیں بلکہ شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ پنڈت برج نراین صاحب

نثر بہت اچھی لکھتے ہیں۔ آپ کے مضامین جو کشمیر درپن۔ زمانہ اور ادیب میں شایع ہو چکے ہیں۔ زیادہ تر ادبی تنقید اور لٹریری تحقیق سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً دیا شنکر نسیم۔ رتن ناتھ سرشار۔ داغ ایک یادگار مشاعرہ۔ وغیرہ وغیرہ۔ پنڈت برج نراین چکبست نے تنقید کا نہایت صحیح اور اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اور آپ کے مضامین زبان کی متانت اور شگفتگی کے لحاظ سے اُردو نثر کے نہایت عمدہ نمونے ہیں؛

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے

تری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ قدرت خورشیدِ پرضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری

سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب یونان کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو

اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سوربیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے

اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنّت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہ رہا ہے دریائے گنگ ابتک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
ابتک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
کرتے ہیں رقص ابتک طاؤس جنگلوں میں
پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حبِّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
اک لاشِ بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حبِّ قومی اس خواب سے جگا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا

ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کہن کا
تُلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

تمام شد